راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

نومبر 2013

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

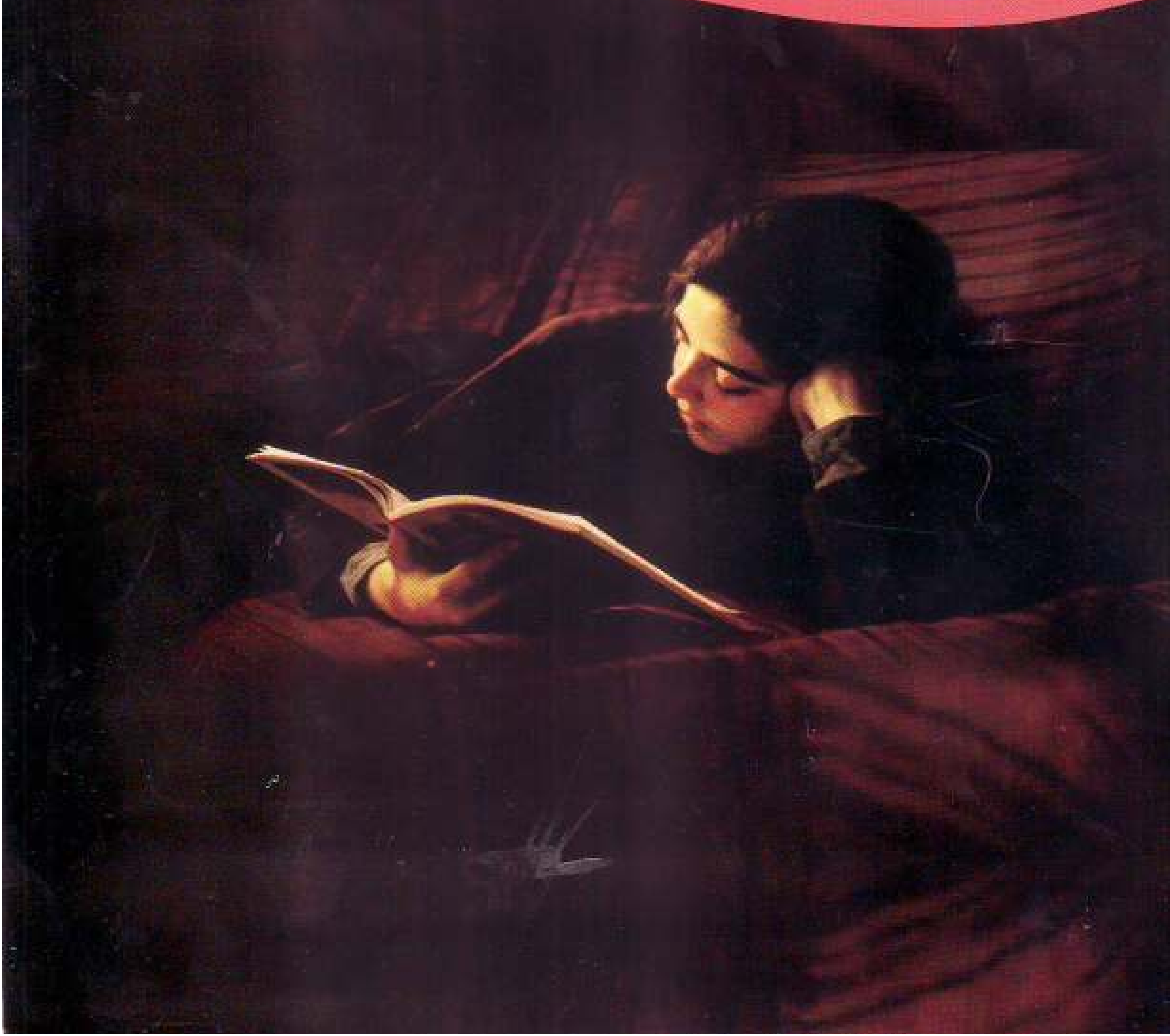

امریکہ میں ادب کے فروغ کے لیے پاکستانی سفارت خانے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے (فرحت زاہد)

معروف شاعرہ فرحت زاہد سے عامر بن علی کی گفتگو

ارژنگ: اپنے بارے میں کچھ بتایئے؟

فرحت زاہد: میں بچپن ہی سے عام بچوں سے مختلف تھی۔ جن دلچسپیوں میں میرے بہن بھائی یا کزنز حصہ لیتے تھے میں ان سے پرہیز کرتی تھی۔ میری طبیعت ذرا ان سے الگ تھی اور میرے خیال میں یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ میرا تعلق بہاولپور سے ہے۔ میرے والد وہاں ریلوے کنٹریکٹر تھے اور وہ یوپی سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ میری پیدائش بہاولپور کی ہے۔ بی اے میں نے بہاولپور ڈگری کالج سے کیا۔ اس کے بعد ایم اے انگلش کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا لیکن تعلیم کے دوران میری شادی ہوگئی جس کے بعد باقاعدہ تعلیمی سلسلے کو ترک کرنا پڑا۔

ارژنگ: لکھنے کی طرف کیسے آئیں؟

فرحت زاہد: بچپن ہی سے ہمارے گھر میں ادبی رسالے نقوش، فنون اور ادب لطیف چھپ کر آتے تھے جن کو میں گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھی۔ شاید اسی دوران کہیں لکھنے لکھانے کے جراثیم نے میرے اندر پرورش کے لیے جگہ بنالی لیکن اس کا ادراک مجھے ایک سال بعد ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں یا مجھے بھی لکھنا چاہیے۔

ارژنگ: ابھی آپ نے جن ادبی جریدوں کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ آپ ان کو گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھیں۔ کیا آپ کے گھر میں ادب پڑھنے پر پابندی تھی یا پھر ان جریدوں میں کوئی قابل اعتراض مواد چھپتا تھا؟

فرحت زاہد: آپ کی دونوں باتیں درست ہو سکتی ہیں۔ وہ ایسے کہ ہمارا گھرانہ ایک کٹر مذہبی قسم کا گھرانہ تھا۔ جس میں خاص طور پر خواتین کو دینداری اور امور خانہ کی طرف دھیان دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چونکہ دور طالب علمی میں ایسے جریدے پڑھنے سے پڑھائی کا حرج بھی ہوتا ہے اس لیے گھر والوں کی طرف سے ایسی قسم کی کتابیں یا رسالے پڑھنے کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔ یوں بھی ان جرائد میں عصمت چغتائی اور منٹو کے افسانے چھپتے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ ادبی شاہپارے اور حقیقت کے ترجمان تھے آج بھی سمجھتی ہوں کہ منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نہ ہی پڑھیں تو اچھا ہے۔

ارژنگ: حالانکہ خود آپ نے وہ افسانے چھپ چھپ کر پڑھے؟

فرحت زاہد: اس لیے ہی تو یہ بات کہہ رہی ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نوجوانی کی عمر دراصل نادانی کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی کسی بات کی گہرائی میں جائے بغیر اس مسئلے کو صرف اوپری سطح سے دیکھتا ہے۔ بعد میں عمر کے ساتھ ساتھ جب انسان تجربات کی بھٹی سے گزرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ حقیقت گمان سے بالکل مختلف ہوتی ہے لیکن عموماً آدمی کو حقیقت کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب وہ عمر کا کافی حصہ گزار چکا ہوتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا مطلب بچوں پر پابندیاں ہونی چاہئیں؟

فرحت زاہد: ہرگز نہیں۔ آپ بچوں کو اعتماد میں لے کر ان کو پیار محبت سے بھی سب کچھ سمجھا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح پرورش پانے والے بچے معاشرے کے بہترین اور کارآمد انسان بن سکتے ہیں۔

ارژنگ: باقاعدہ طور پر پہلی دفعہ کب لکھا؟

بقیہ صفحہ نمبر 37

"اور مت پیروی کرو تم ...... (القرآن)"

MONTHLY ARXANG LAHORE.

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 15 نومبر 2013ء شمارہ نمبر ۱۰

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی   مدیر: حسن عباسی

مدیرانِ اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم،

نائب مدیر: زبیر بشیر   کامران ندیم

مدیر پنجاب رنگ و انچارج شعبہ اشتہارات: نازاد کاڑوی

Editor English Section / Ayesha Zee Khan

پتا برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0300-4489310

Nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 60 روپے زر سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

حمد و نعت: خالد احمد، شاہین عباس، ڈاکٹر اظہار احمد گلزار ' ۲

نعتیہ کلام: پیرزادہ حمید صابری / لاہور ' ۳

مضامین:

○ ناصر علی کی شاعری / جیلانی کامران ' ۴

○ صغریٰ صدف کا وعدہ / محمد عرفان احسن پاشا ' ۷

○ الفاظ اور یادیں / محمد ممتاز راشد ' ۱۰

○ سید تجمل عباس...... شخصیت و خدمات کے آئینے میں / ڈاکٹر ہارون الرشید ' ۱۲

○ ضمیر کی تلاش / عطاء الحق قاسمی ' ۱۴

○ عوامی صدر، عوامی ادیب اور عوامی چور / حافظ مظفر محسن ' ۱۶

○ متفرق شاعری ' ۱۸ تا ۲۲

افسانے

○ جدائی کا درد / بی بی حلیمہ بشریٰ ' ۲۳

○ بھوک / دستگیر شہزاد ' ۲۵

○ نامہ سیاہ میں تھی / نسیم سکینہ صدف ' ۲۹

○ بغاوت / احمد عدنان طارق ' ۳۱

○ ادھوری کہانی / نیازت علی نیاز ' ۳۳

○ آئینے میں ٹھہری ہوئی تصویریں / شہزاد ملک ' ۳۵

شعری گوشے: لطیف ساحل، قاضی عطاء الرحمٰن، پروفیسر اکرم ناصر، شاہدہ لطیف، جان عالم، انیس احمد، ڈاکٹر خالد جاوید جان، علی افتخار جعفری، سلیم کورمانی، رخسانہ سحر، عزت مآب، شکیلہ ستارہ، میجر (ر) خالد نصر راجہ، عامر سہیل ۳۹ تا ۵۳

پنجاب رنگ ' ۴۵ تا ۵۶

○ قینچی / عبدالرشید ' ۵۷ تن دیپ تمنا ' ۵۸ سرمد سوہل ' ۵۹

ادبی خبریں / تقریبات ' ۶۰

تبصرہ کتب ' ۶۲

نامہ ہائے احباب ' ۶۷

Poetry of the month 70 to 72

بیرون ملک ارژنگ دوست

○ امریکہ، شکیل سروش
○ بحرین، اقبال طارق
○ دوحہ، قیصر مسعود
○ سعودی عرب، اسلم گمان
○ دبئی، سلمان جاذب
○ ابوظہبی، طارق بٹ
○ کویت، صفدر علی صفدر
○ یوکے، سعدیہ سیٹھی
○ ناروے، ارشد شاہین
○ شارجہ، نوید انور
○ کینیڈا، شعیب صادق
○ اسپین، نذیر اے قمر
○ فرانس، اسد رضوی
○ آسٹریلیا، ظفر اسلام
○ سویڈن، عابدہ سیال
○ ڈنمارک، صفدر علی آغا
○ العین، سعید پسروری

Far East Marketing Co.
Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5,
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

نے زاہد بشیر پریس ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا

حمد ونعت

ہم اپنی حمدیہ چپ سے سفر آغاز کرتے ہیں

حمدیہ

رب گل! رب رنگ! رب بہار!
ایک نقش اور، رب نقش و نگار
وسعت کائنات عشق دکھا
رب قوسین! نقطہ پرکار
کس لیے اردگرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ در و دیوار
جرس گل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار
راکھ کب تک کریدتے دل کی
ڈال کر سر یہ ہو گئے تیار
جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار
ہر سخن تھا ہم اہل غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار
اک نم آہنگ حزنیہ لے پر
کیسے تھم تھم کے چل رہے تھے یار
دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سرو دستار
کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دلاوروں کا شمار
کچھ چھپایا نہ ہم نے دنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار
اک مذلت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار
تخت مرمر پہ کل تھے آسودہ
مرمر آسودگان زیر مزار
آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

(خالد احمد)

حمدیہ، نظمیہ، رزمیہ

ہم اپنی حمدیہ چپ سے سفر آغاز کرتے ہیں
مسلسل بھیگتے ہیں الوداعی بارشوں کی
دائمی دھن میں
گھروں کا اور گلیوں کا تسلسل ٹوٹتا تھا
ہماری نظمیہ چپ سے ذرا پہلے
شکایت تھی
روایت بار برداری کے کام آتی نہیں
روایت تھی کہ رخنہ
صفِ تاریخ میں
صفِ ترتیب میں رخنہ
کتابی لوگ تھے، لیکن
زبانی جنگ لڑتے تھے،
زبانی صلح کرتے تھے
ہماری رزمیہ چپ سے ذرا پہلے!
تو اے بے حمدیہ زد پر
بہت بے رزمیہ انساں
بہت بے نظمیہ حیواں
تجھے بھی بارشوں میں ساتھ رکھنا ہے
صف آراؤں کے بے توحید نرغے میں
کماں داروں کی بے تمجید گھاتوں میں
نشانہ باز، بے اعراب باتوں میں
ہمیں اس حمدیہ چپ کی
نگہ داری ہی کافی ہے
تجھے بھی اس نگہ داری کی نم داری میں
لانا ہے، بچانا ہے!!

(شاہین عباس/شیخوپورہ)

نعت

پیامِ خدا ہے پیامِ محمدؐ
خدا جانتا ہے مقامِ محمدؐ
نہ ہوگا کبھی اُس کا ایمان کامل
نہیں دل میں گر احترامِ محمدؐ
اسے حشر تک تشنگی نہ رہے گی
پیا جس نے اک بار جامِ محمدؐ
محمدؐ کا رُتبہ میں کیسے بتاؤں
ہے عرشِ بریں زیرِ گامِ محمدؐ
خدا بخشتا ہے گناہ اُس کے سارے
پڑھے جو صلوٰۃ و سلامِ محمدؐ
ملے دین و دُنیا کی دولت اُسی کو
عقیدت سے جو پڑھے نامِ محمدؐ
مقدر پہ اظہار قربان جاؤں
کہ میں ہوں غلامِ غلامِ محمدؐ

(ڈاکٹر اظہار احمد گلزار/فیصل آباد)

پیرزادہ حمید صابری / لاہور

جتنا چاہوں خرچ کروں یہ مال نہیں گھٹنے والا
غم کی دولت دے کر اُس نے ایسا مالا مال کیا

پیرزادہ حمید صابری ایک عرصہ سے فنِ نعت گوئی کے مقدس تخلیقی عمل سے وابستہ ہیں اور عشقِ رسول کی سرشاریوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نبی رحمتؐ سے محبت اور عقیدت ان کی تمام نعتیہ شاعری میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ "کلیدِ فردوس" کے نام سے ان کا نعتیہ مجموعہ شاعری بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تمام نعتیہ شاعری عشقِ نبی کی خوشبوؤں میں رچی بسی ہے۔ سادگی اور پرکاری ان کی شاعری کا ہمیشہ سے حصہ رہی ہے۔ پیرزادہ حمید صابری نے حضرت احسان دانش اور حضرت علامہ ذوقی مظفر نگری جیسے اساتذہ فن کی علمی اور ادبی صحبتوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ایک عرصہ سے ریڈیو پاکستان لاہور سے بسلسلہ روزگار وابستہ ہیں اور اپنے فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔

ادھر غنچے چٹکتے ہیں اُدھر تارے دمکتے ہیں
نبی کے ذکر سے ارض و سما کے دل دھڑکتے ہیں

صبا جس دم درودوں کی بہاریں لے کے آتی ہے
کرم کے پھول اُمیدوں کے گلشن میں مہکتے ہیں

تصور میں جب آتا ہے جمالِ گنبدِ خضریٰ
تمناؤں میں ڈھل کر آنکھ کے آنسو ڈھلکتے ہیں

بھلا بیٹھے ہیں جو قرآن کی تابندہ منزل کو
وہی کم بخت گمراہی کے جنگل میں بھٹکتے ہیں

رہِ عشقِ محمدؐ میں جنہیں چلنے کی عادت ہے
نہ وہ رُوحیں جھجکتی ہیں نہ وہ پیکر ٹھٹکتے ہیں

چمن میں جب حمیدؔ آتی ہے آہٹ سرورِ دیں کی
وفا کی ٹہنیوں پر طائرانِ غم چہکتے ہیں

دل جب نبی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار
ارمان چشمِ دید کے ہوتے ہیں اشکبار

روضے پہ اپنے مجھ کو بلا لیجیے حضور
چہرے پہ زندگی کے نہیں رنگ اعتبار

غم کیوں نہ چھلکیں آنکھ سے پیشِ رسولؐ پاک
اُن کے سوا ہے کون زمانے میں غمگسار

اللہ چشمِ شوق کو جلووں کی بھیک دے
روتا ہے دل فراقِ محمدؐ میں زار زار

عاصی ہوں لاکھ پھر بھی یہ مجھ کو یقین ہے
حامی ہیں روزِ حشر دو عالم کے تاجدار

رحمت نے لے لیا مجھے آغوش میں حمیدؔ
اپنے کیے پہ جب بھی ہوا ہوں میں شرمسار

جس پر خدا کے فضل سے لطفِ رسولؐ ہو
وہ شخص کائنات میں کیونکر ملول ہو

تنہائیوں میں لب پہ جو ذکرِ رسولؐ ہو
کوثر کا جام تشنہ لبوں کو حصول ہو

جس گھر سے ہوں بلند صدائیں درود کی
اُس گھر پہ رحمتوں کا مسلسل نزول ہو

چشمِ الم سے غم کے جو چشمے اُبل پڑیں
رونا مرا فراقِ نبیؐ میں قبول ہو

جس میں حمیدؔ پیش ہو آقا کے رُوبرو
اُس ساعتِ سعید میں صدیوں کا طول ہو

دل کُشا دل کُشا ہے نبیؐ کا کلام
جاں فزا جاں فزا ہے نبیؐ کا کلام

روشنی روشنی اُن کا دستور ہے
گُل ادا گُل ادا ہے نبیؐ کا نظام

خشک روٹی، کھجوریں، نمک اور آب
کتنا سادہ رہا ہے نبیؐ کا طعام

ربِ کونین نے اپنے قرآن میں
خود قصیدہ لکھا ہے نبیؐ کا تمام

جو ہے مدحِ نبیؐ میں مگن روز و شب
اس پہ در بھی کھلا ہے نبیؐ کا مدام

اس میں مضمر ہے سارے مسائل کا حل
یعنی عقدہ کُشا ہے نبیؐ کا نظام

عشقِ آقا کا اعجاز صلِ علیٰ
رُوح میں ہو گیا ہے نبیؐ کا قیام

حشر میں سنتیں اوڑھ کر میں گیا
شور اُٹھا آ گیا ہے نبیؐ کا غلام

آپ کی ہے رسالت سدا کے لیے
لایزل سے جڑا ہے نبیؐ کا مدام

عقلِ انساں میں آئے یہ ممکن نہیں
بس خدا جانتا ہے نبیؐ کا مقام

جو چلا راہِ تبلیغِ دیں پر حمیدؔ
اُس پہ نازل ہوا ہے نبیؐ کا سلام

ناصر علی کی شاعری

جیلانی کامران

شاعری کے باب میں غالباً غزل ایک ایسی شے ہے جسے صرف وصول کیا جاسکتا ہے، لیکن جس کے بارے میں تجزیاتی عمل کو روا رکھنا ممکن نظر نہیں آتا۔ قدیم اساتذہ نے اس مشکل کا آسان حل نکالا تھا۔ انہوں نے علم البیان کو بروئے کار لایا تھا اور بحور، عروض، مضامین اور قوافی اور سنگلاخ زمینوں کا ذکر کر کے غزل کی شاعری کو ساخت بنا دیا تھا اور اس طرح ہر نئے غزل گو کو اس رشتے کے تحت پہچانے کی روایت قائم کی تھی۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے غزل کے استعماراتی خدوخال کو معانی کا وسیلہ بنایا گیا اور غزل کے بطن سے معانی اخذ کرنے کی روش کو اختیار کیا گیا۔ تاہم یہ امر سمجھنے کا ہے کہ کیا غزل کے کوئی معانی بھی ہوتے ہیں؟ ایک اُلجھا ہوا مسئلہ بن چکا ہے!

شاید یہی وجہ تھی کہ جب ناصر علی نے مجھے اپنی غزلیں پڑھنے کو دیں اور کہا کہ میں ان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ کر دوں تو مجھے ایک انجانا خوف محسوس ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوعمری کے زمانے میں شاعری سے معانی اخذ کرنے کی کوشش میں نے ضرور کی تھی۔ کیونکہ شاعری سکول اور کالج کے درسی نصاب کا جز تھی اور شاعری کو پڑھایا جاتا تھا کہ نوعمر ذہن شاعری کے معانی سے آشنا ہو سکیں لیکن ایک طویل عرصہ شاعری کے ساتھ گزارنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں یہ ہے کہ شاعری پڑھنے کی شے ہے۔ اسے معانی کا مضمون نہیں بنایا جاسکتا۔ اسے صرف وصول اور قبول کیا جاسکتا ہے جیسے پھول کی خوشبو کو وصول اور قبول کیا جاتا ہے لیکن اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خوفزدہ ہوا تھا اور ناصر علی کے اصرار کے باوجود میں ان کی غزلوں کے بارے میں کچھ لکھنے کے بارے میں ہچکچا رہا تھا!

ناصر علی کی غزل نے مجھے ایک نئے اسلوب سے آگاہ کیا ہے جسے زندگی اور غزل کی زبان کے باہمی رشتے کی صورت میں پہچانا جاسکتا ہے۔ اگر ناصر علی کی غزل سے زبان کو منہا کر دیا جائے تو صرف ایک خاکہ اور شاعر ایک دوسرے کے آمنے سامنے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس ڈایا گرام میں شاعر کی بجائے ایک شخص دکھائی دیتا ہے جسے انسان دیکھتا ہے۔ دیکھنے کے التزام سے جو ہیجان رونما ہوتا ہے اسے بیان کرنے سے شاعری پیدا ہوتی ہے۔ ناصر علی نے غزل کی زبان استعمال کر کے اس ہیجان کو بیان کیا ہے جو ناصر علی نے انسان ہونے کے ناتے حاصل کیا ہے۔ ناصر علی کی شاعری میں اس ہیجان کی شکل وصورت منفرد ہے۔

ناصر علی کا زندگی سے آمنا سامنا اضطراب بن کر رونما ہوا ہے۔ اس اضطراب نے اسے ہیجان دیا ہے۔ ناصر علی کا کہنا ہے زندگی پر اختیار کا جبر حاوی ہے۔ اس لیے زندگی اپنے اصل خدوخال میں دکھائی نہیں دیتی۔ جس زندگی سے اس کا تعارف ہوا ہے وہاں ہر شخص فنا کے خوف میں مبتلا ہے اور اسیر وہم وگماں ہے۔ زندگی کی ایسی ترتیب میں سے گزرنے کا عمل ناصر علی کو جس ہیجان سے آشنا کرتا ہے اسے غزل کی زبان میں بیان کرتے ہوئے ناصر علی نے اپنا شعری سفر تشکیل دیا ہے لیکن

میں جس مقام تمنا پر ٹھہر جاتا ہوں
پھر اس مقام سے آگے گلی نہیں ہوتی!

ناصر علی کی شاعری جبریت کے تلخ احساس سے اپنا لہجہ اخذ کرتی ہے۔ اس ضمن میں یہ شعر غور طلب ہے۔

جو ہو رہا ہے وہ اثبات ہو کے رہتا ہے
جو ہو رہی ہے نفی وہ نفی نہیں ہوتی!

یہ شعر عجیب سے مفہوم کی خبر دیتا ہے کہ زندگی کا سلسلہ محض نفی کا اثبات ہے۔ جو عمل جاری ہے اس کا اپنا مزاج ہے اور انسان کا اس مزاج کے ساتھ شاید کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ایک شاعر کے طور پر ناصر علی اس مزاج کے ساتھ اُلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس فکر میں ہے کہ ایسے مزاج ہستی کے ساتھ کیسے مفاہمت کی جائے؟ اور کس طرح زندگی کے عمل کو حیات مستعار کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ یہ ساری کیفیت سوالوں کی صورت پیدا کرتی ہے۔ ناصر علی کی غزل استفہامیہ انداز کی شعری صورت حال کو نمایاں کرتی ہے۔ ناصر علی کی غزل میں

زندگی اور انسان کے مابین غیریت کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ زندگی انسان سے بے تعلق اور بے غرض ہے۔ ایسے نقشے نے پریشانی کا ایک گہرا تاثر ناصر علی کی غزل کا منظر اور پس منظر بنایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ناصر علی نے اپنی غزل میں زندگی کے جس چلن کو محسوس کیا ہے اس سے صرف پامالی ہی کا ادراک ہوتا ہے اور انسان کا وجود بے حقیقت دکھائی دیتا ہے۔

زندگی کے اس پھیلے ہوئے نقشے میں ناصر علی نے جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان میں نمایاں مقام احساسِ مرگ کا ہے۔ دل میں حیرت کا معدوم ہونا ہے۔ کائنات کے بارے میں تحیر کی نایابی اور وقت کا میکانکی تسلسل اور زبان کا خیر و شر میں مبتلا ہو کر حق و باطل کی صورتوں میں ظاہر کرنا ناصر علی نے اس نقشے میں غزل کی اصطلاحیں پھیلائی ہیں جو یار، عاشق، شوق، شرر، تمنا، جلوۂ حیرت نما، ادائے یار، لکیر دستِ دعا، جام اور عکسِ جام، لذتِ گناہِ ازل، سانۂ رو مابعد، تیغِ ادا، تیرِ نظر، یارِ طرحدار، کوچۂ دلدار، چشمِ تماشا اور تماشہ گری کی تراکیب میں ظاہر ہوئی ہیں۔ ایسے منظرنامے میں ناصر علی نے حسینۂ ہستی کا پیکر بھی آشکار کیا ہے اور اس سے پوچھا ہے۔

ذرا بتا تو سہی اے حسینۂ ہستی
ترا گداز ہے کیا تیرا پیچ و خم کیا ہے؟

ناصر علی کی شاعری اس گداز اور پیچ و خم کی شاعری ہے!

مجھے ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے خیال گزرا ہے کہ ناصر علی نے غزل کے پیرائے میں نظم لکھی ہے اور ان کو نظم کے طور پر پڑھنے سے ان کے ساتھ متعارف ہونا ممکن ہے۔ اس ضمن میں اشعار کی ترتیب کو کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

اک شورشِ وجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
سجدہ، رکوع اور دعا ہے گلی گلی
میں لذتِ گناہِ ازل کا اسیر ہوں
پھیلی ہوئی یہ جس کی سزا ہے گلی گلی
وحدت نہیں تو اور یہ کیسا مقام ہے
کہتے ہیں یار لوگ خدا ہے گلی گلی!

اور ان کے ساتھ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا، یہ عقل حیرت سے
خدا کے ساتھ کھڑے دیوتا کو دیکھتی ہے

انسانی صورت حال کی ایسی صورت گری ناصر علی کے شعری شعور کی ایک خاص جہت ہے!

ناصر علی ایسے صبر آزما زمانے کو محض عکس گری کا موضوع بنا کر رک نہیں جاتا، اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس کڑے منظرنامے سے آشنا ہوا ہے اسے اپنے تجربے کی توانائی کے ذریعے تسخیر کرنے کا آرزومند بھی ہے اور ہر چند کہ اس نے ایک مقام پر تمنا اور بندگی کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاہم اپنے شعری سفر میں وہ جس مقام پر پہنچا ہے اس کی صورت یوں ہے۔

تازگی نے کئی کھڑکیاں کھولیں ناصؔر
اور فرسودگیٔ دل کو پرے پھینک دیا!

اس ضمن میں جو امر قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ناصر علی نے غزل کی روح سے جو غزل کی تراکیب میں جاری و ساری ہے اور جن کی جانب اشارہ بھی کیا گیا ہے، اپنے شعری سفر کی توانائی حاصل کی ہے۔ اگر ناصر علی کی غزلوں سے غزل کی ان تراکیب کو نکال دیا جائے تو صحرائے وحشت باقی رہ جاتا ہے۔ غزل کی اصطلاحوں میں یار اور عاشق کے دو استعارے ایسے ہیں جو شاعر کے انسانی وجود کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے شعری سفر کے دوران ناصر علی اپنے باطن سے روشناس ہوا ہے۔ اس کی ایک غزل (حق بھی اندر ہے میرے.....) سراغِ باطن کا پتہ دیتی ہے۔

یہ کیسا دل لے کر وہ اتنا تڑپاتا ہے
دل بھی اندر ہے دل کی دھک دھک بھی اندر ہے!

سراغِ باطن شاعر کو ڈھونڈنے کی راہ دکھاتا ہے۔ اس سلسلے میں ضمیر غائب کا آشکار ہونا معنی خیز ہے۔ ضمیر غائب نے شعری سفر کے دوران شاعر کو زندگی کے جابر تسلسل سے رستگاری دلائی ہے!

ناصر علی کے شعری سفر میں دو دنیائیں ظاہر ہوئی ہیں۔ ایک دنیا کی شکل و صورت زمانے اور زمانے کے اندر مضمر نہ بجھ آنے والے تسلسل اور جبر کی ہے اور اس انسانی برتاؤ کی ہے۔ جہاں نیکی اور بدی ایک دوسرے میں جذب ہو کر مخلوط پیکر اختیار کرتے ہیں۔ دوسری دُنیا کی تشکیل غزل کے الفاظ کرتے ہیں جن کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس شعری سفر میں غزل کے الفاظ کی توانائی سے سفر کا استعارا تقویت پاتا ہے۔ ابتداء میں یہ شعری سوالات کی زد میں دکھائی دیتا ہے اور خیال گزرتا ہے کہ سوالات کیوں؟ اور کیسے؟ شعری سفر کی تحریک کو ممکن بناتے ہیں اور جیسے ہی یہ سفر اپنا آغاز کرتا ہے سوال بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور شاعر

مشاہدے اور شوق کے اصولوں کے تحت سفر کرتا ہے اور منزل بہ منزل گزرتے ہوئے زندگی کی شناخت کرتا ہے۔ اس سفر کے آغاز ہی میں شاعر نے حسینہ ہستی سے استفسار کیا ہے کہ اس کے گداز و پیچ وخم کی کیفیت کیا ہے۔ اس اعتبار سے ناصر علی کا سارا شعری سفر اس گداز اور پیچ وخم کو پہچاننے کا سفر بھی دکھائی دیتا ہے۔

زندگی کو حسینہ ہستی کے استعارے میں بیان کرتے ہوئے ناصر علی کے شعری سفر نے دو کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ایک یہ کہ وجود اور ہست کے سلسلے کے جبر کو دوشیزہ کے تمثال نے سنگینی کے بجائے آشفتگی اور اضطراب میں بدل دیا ہے اور دوسری یہ کہ ان کیفیات نے شاعر کو زندگی کی خوبصورتی کو تلاش کرنے کی جانب راغب کیا ہے۔ ناصر علی کی شعری دنیا میں جہاں حسینہ ہستی کا ذکر ہوا ہے وہ بے ساختہ اور لگتا ہے کہ یہ ترکیب ان دیکھے منطقوں سے فوری طور پر اُتر آئی ہے اور ناصر علی کے شعری سفر میں شامل ہوئی ہے۔ ناصر علی کے شعری سفر میں حسینہ ہستی کا استعارہ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔

اس امر کو میں ایک بار پھر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ناصر علی نے غزل نہیں لکھی ہے بلکہ غزل کا قالب بروئے کار لایا ہے۔ یہ امر اس لیے ضروری ہے کہ اس کی غزل نظم کا پیکر اختیار کرتے دکھائی دیتی ہے۔

ناصر علی کے شعری سفر کے دوران کئی مقام آئے ہیں۔ جہاں وہ سوالوں اور انسانی حدود اربعے میں گھرا ہوا نظر آتا ہے لیکن کوئی سفر ایسا نہیں ہے جس کی منزل سفر میں شامل نہ رہی ہو۔ اس لیے ایک ایسا مقام بھی آیا ہے جس کی حکایت ذیل کا شعر بیان کرتا ہے۔

میں نے اندیشہ مشکل کو پرے پھینک دیا
یعنی خواہش سے بھرے دل کو پرے پھینک دیا

جس غزل میں یہ شعر مطلع بن کر آیا ہے اس میں شاعر نے اپنے وجود کی شکست وریخت کا واقعہ بیان کیا ہے۔ خواہش کی منفی صورت باقی نہیں رہتی۔ شوق طلب رونما ہو کر سفر کا استعارہ بنتا ہے۔ وجود کا رنگ و روغن بدلتا ہے اور یار کا استعارہ اپنے تیر نظر سے گھائل کو راہ سفر میں بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔ ناصر علی کے شعری سفر میں یہ مقام ایک نئے انسان کو رونما ہوتے دیکھتا ہے اور اس انسان کا اندازِ نظر مختلف ہوتے دکھائی دیتا ہے۔ اگر ایسا انسانی وجود رونما نہ ہوتا تو وہ منظر بھی نظر نہ آتا جس کی اطلاع یہ مصرعہ فراہم کرتا ہے۔

غم کے بعد خوشی کی باری آنے دینی ہے!

سوالوں کی منزل کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ خوشی کا زمانہ بھی آسکتا ہے۔ ناصر علی کے شعری سفر میں یہ زمانہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے خدوخال کا جائزہ غور طلب ہے۔

شعری سفر کے اس مقام پر آزادی کا کھلا ہوا موسم آشکار ہوا ہے اور شاعر زندگی سے ایک نئے احساس کے ساتھ متعارف ہوتے نظر آتا ہے۔ دل سوالوں کی زد سے آزاد ہو کر اپنے لیے اظہار کا راستہ خود تلاش کرنے کا خواہش مند ہے اور خوشیوں کی رُت میں خارجی فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور مسلسل سفر اپنا آغاز کرتا ہے۔ اس منظر میں کلائی کا استعارہ ایسا ہے جیسے دوشیزہ کا اندازِ تلطف بھی بیان کرتا ہے اور حسینہ ہستی کے ساتھ بھی جس کی نسبت کو باور کیا جاسکتا ہے اور زندگی کی ہر ادا کو کھلے وجود کے ساتھ قبول بھی کیا جا سکتا ہے۔ ناصر علی اپنے شعری سفر کے اس مقام پر ہست اور وجود کے ساتھ شاید کوئی ذاتی عہد نامہ لکھتے دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اچھی شاعری ہر منزل اور ہر مقام پر زندگی کے ساتھ ایک عہد نامہ لکھتے دکھائی دیتی ہے۔ ایسے عہدنامے کے بغیر شاعری کا کوئی بھی مفہوم نظر نہیں آتا۔ اس عہدنامے کی وضاحت کرتے ہوئے ناصر علی بیان کرتا ہے:

ہے ذکر تیرا، دم دم دم دم
اندر کے زخموں پہ مرہم
نورانی چاند کے ہالے میں
ہے روشن چہرۂ آدم
ہر منظر میں اس کا جلوہ
ہلکا ہلکا مدھم مدھم
دریا کی لہروں کے راہی
خاموش سمندر کے محرم
بکھرے بکھرے سے رہتے ہیں
اپنی ترتیب لگا کر ہم!

اس مشاہدے کو ضرورت نہیں کہ ہم آسانی مفہوم دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسینہ ہستی کے تمثال سے جو چہرہ ناصر علی کے شعری سفر میں ظاہر ہوا ہے وہی چہرہ شاعر کا حدود اربعہ بنا کر اسے ایک ایسی معرفت سے روشناس کر رہا ہے جو جسم کے حوالے سے ہر شے میں ایک باہمی حمد و توصیف کی ساعت کرتا ہے۔ انسان کا کام حمد و توصیف کا مشاہدہ کرنا ہے اور شاعر کا کام اس سے بہرہ مند ہونا ہے۔ ناصر علی نے اپنے شعری سفر میں جس مقام کی خبر دی ہے اس مقام کا ادراک جاری زمانے کی ازلی ضرورت ہے!

ڈاکٹر صغریٰ صدف کا "وعدہ"

محمد عرفان احسن پاشا

ڈاکٹر صغریٰ صدف ہمہ گیر اور ہمہ جہت خاتون ہیں۔ وہ بیک وقت شاعرہ، ادیبہ، مدیرہ، کمپیئر، کالم نگار، براڈ کاسٹر، فلسفی دانش ور، منتظم اور بیوروکریٹ ہیں اور آج کل پنجابی ادب وثقافت اور فنون کی بہتری اور ترویج کے لیے کوشاں سرکاری ادارے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر (پلاک) کی ڈائریکٹر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی نبھا رہی ہیں۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ ایک انتہائی نرم دل انسان، معاون شریک کار، انسان دوست تخلیق کار اور ایک پیار کرنے والی ماں بھی ہیں۔ خواتین کو عموماً زیادہ رقیق القلب سمجھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صغریٰ صدف میں یہ وصف بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا منصب حاکمانہ ہونے کے باوجود ان کا مزاج حاکمانہ نہیں اور ان کے عملے کے چھوٹے سے چھوٹے عہدے کے لوگ بھی ان سے خوف نہیں کھاتے اور ان سے اپنے نا صرف مسائل شیئر کرتے ہیں بلکہ ان کے حل کے بھی طلب گار ہوتے ہیں جس میں انہیں کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ ان تمام شخصی اور تخلیقی خوبیوں میں ان کو سب سے زیادہ لگاؤ اپنی شاعری سے ہے جس میں ان کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شاعری کی زبان میں انہیں غم دوراں اور غم جاناں دونوں سے عہدہ برآ ہونے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف کی شاعرانہ تخلیق "وعدہ" کے عنوان سے ہمارے سامنے ہے۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جس کا مطلب ہے کہ پہلا ایڈیشن اپنا وجود منوا کر تقسیم ہو چکا۔ ہمارے جیسے انحطاط پذیر معاشرے میں کسی ادبی کتاب کا دوسری بار شائع ہونا یقیناً ایک اہم واقعہ ہے۔

محبت صغریٰ صدف کی شاعری کا بنیادی موضوع اور ان کی شخصیات کا اصلی جوہر ہے ان کے ہاں محبت کے بہت سے رنگ جھلکاریاں مارتے ہیں اور اس کی بہت سے لہریں چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک مشرقی الہڑ دوشیزہ کے کسی اجنبی سے پیار کی کہانی ان کی شاعری سے مترشح ہے جو اسے پیار کے ذائقے سے آشنا کر کے دور چلا جاتا ہے اور وہ عمر بھر اس کی راہ دیکھتی رہتی ہے۔ جہاں ایک نوخیز لڑکی کو پیار کے پہلے تجربے کا سامنا ہوتا ہے اور اس کے دل میں پیار کی امنگ انگڑائیاں لیتی ہے۔ وہ اس خمار میں اپنی ہستی بھی تج دیتی ہے۔ محبت کا یہ احساس ٹین ایجرز اور کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں جیسا ہے جس میں میچور اور سنجیدہ عورتوں کی گمبھیرتا نہیں بلکہ نوبلوغت کے زمانے میں تخیل کی اڑان بھرنے والی لڑکیوں کا الہڑ پن ہے۔ صغریٰ صدف کے ہاں محبت کے انتہائی کومل جذبات اور اس سے وابستہ پیار کی واردات کا بیان پروین شاکر کی یاد دلاتا ہے۔ صغریٰ صدف محبت کا کائنات کا احسن جذبہ سمجھتی ہیں جسے ایک بار شروع کر لیا جائے تو بہر حال بحال رکھنا ہوتا ہے۔ چند شعر دیکھئے:

دیکھا تھا کبھی پیار بھری ایک نظر سے
دل ہے کہ نکلتا ہی نہیں اس کے اثر سے

ہاتھ جب آیا کسی کا ہات میں
رو پڑی میں شدت جذبات میں

کون آیا ہے تصور میں مرے
روشنی ہے کیسی میرے آس پاس

کیسے کروں گی اس کی نگاہوں کا سامنا
جو شخص آنکھوں آنکھوں میں کرتا ہے گفت گو

جھانکتی ہوں میں دریچے سے اسے
دیکھتا ہے وہ بھی مجھ کو بام سے

آج صدف میں بے حد خوش ہوں
آج پھر اس سے ملنا ہو گا

جو بن گیا وہ تعلق بحال رکھنا ہے
تری نشانی کو دل میں سنبھال رکھنا ہے

میں سوکھنے نہیں دوں گی شجر محبت کا
سو دھیان اس کا مجھے ڈال ڈال رکھنا ہے

ان کے دل میں محبت کا جذبہ کوٹ کر بھرا ہے لیکن معاشرتی حد بندیوں اور قیود کی وجہ سے وہ نا رسائی کا شکار بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں ایسی عورت کے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اپنے محبوب کو بے انتہا چاہنے کے باوجود اپنی شرم وحیا اور معاشرتی حدود وقیود کا پاس رکھتے ہوئے اس کا قرب حاصل نہیں کر پاتی یا اس تک پہنچ نہیں پاتی۔ یہ سوچ کبھی اس عورت کا المیہ بھی سامنے لے آتی ہے جو اپنے محبوب

کو بظاہر پالیتی ہے لیکن اس کی تشنگی ختم نہیں ہو پاتی اور وہ رسائی کے باوصف نارسائی کا شکار رہتی ہے۔ہمارے معاشرے میں ایسی بے شمار عورتیں موجود ہیں جن کی نمائندگی صغریٰ صدف نے ''وعدہ'' کی شاعری میں کی ہے۔ان کی زندگی میں ایک مستقل انتظار سرایت کر جاتا ہے جس کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔

میں وصل کی دہلیز پہ مدت سے کھڑی ہوں
شائد وہ پلٹ آئے جدائی کے نگر سے

یہ میرا مسئلہ ہے کہ کیسے کروں قیام
پہلے وہ اپنے دل میں اترنے تو دے مجھے

بیان کر نہ سکی حال دل صدف ورنہ
چلی گئی تھی گلی تک تو حوصلہ کر کے

اسے فرصت نہیں ہے دیکھنے کی
صدف یوں ہی سنورتی جا رہی ہوں ،

بظاہر چاند تاروں سے جڑی ہے زندگی میری
مگر صحرا کی وحشت سے کڑی ہے زندگی میری

ان کی شاعری میں عورت کا وہ روایتی انداز بھی نظر آتا ہے جب وہ محبت کا جواب محبت میں نہ ملنے کی صورت میں انتقامی روش اختیار کر لیتی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں عورت کو نظر انداز کیے جانے کے رویے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے انتقام کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکے اور ایک مکمل انسان کی صورت میں اپنی شخصیت کی نفی کا بھرپور جواب دے سکے۔ایسے مقامات پر ان کا لہجہ کبھی تو طنز کے نشتر چلاتا ہے اور کبھی چیلنج کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اور اس سے بھی اگلے زینے پر وہ اس ظلم کے مقابل سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو کر اس سے بھڑ جانے کا اظہار کرتی ہیں۔یہ ان کا ذاتی حوالہ بھی ہے اور عورت کا بحیثیت مجموعی بھی۔

تم نے دیا ہے ترکِ تعلق کا عندیہ
رازوں سے پردہ میں بھی اٹھاؤں اگر کہو

جنگلوں میں جا بسیں جی چاہتا ہے یہ صدف
بھیڑیئے دیکھے ہیں میں نے آدمی کی کھال میں

'وعدہ' کی تمام شاعری ایک عورت کی تخلیق معلوم ہوتی ہے اور اس میں عورت کے دلی جذبات، ذہنی کیفیات اور اس کے مسائل کی بہت عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔اسے جدید تنقیدی اصطلاحات میں تانیثی اظہار کا نام دیا جاتا ہے۔صغریٰ صدف کی ایک غزل کی ردیف ہی ''سہیلیو'' ہے جس میں انہوں نے اپنی سہیلیوں کو مخاطب کر کے اپنے ان تمام مسائل کا ذکر کر دیا ہے جو آج کے دور میں عورت کو درپیش ہیں۔اس غزل کا انداز شادی کے کافی عرصہ بعد پلٹ کر گاؤں میں آنے والی لڑکی کے اپنی سہیلیوں کے ساتھ راز و نیاز جیسا ہے۔اس کے علاوہ غزلوں میں بھی انہوں نے عورت اور اس کے مسائل اور ہمارے معاشرے میں عورت کے بارے میں عمومی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے جو بہر حال عورتوں کے حق میں نہیں لیکن ڈاکٹر صغریٰ صدف نے کمال پامردی سے اس فرسودہ سوچ کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور پسے ہوئے طبقہ نسواں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

ٹھہری ہے زندگی کی روانی سہیلیو
چھیڑو کوئی تو بات پرانی سہیلیو
ہائے کبھی جو بات تمہاری میں مانتی
بنتی نہ میری زیست کہانی سہیلیو
کیسے تھے میرے خواب کہ جو خواب ہو گئے
مجھ کو بتاؤ میری پرانی سہیلیو

حوا زاد ہونا ہی جرم تھا صدف اور میں
یہ گناہ پاکیزہ بار بار کر بیٹھی

دیکھوں میں کس طرح حد افلاک سے پرے
ہوں بند کوٹھڑی میں تری کائنات کی

جس کی رضا کو اپنی رضا جانتی رہی
اس نے نفی ہی کی ہے صدف میری ذات کی

عورت ہوں میں، قلم مرا چاہت کے واسطے
پروین کی تمنا ہوں سیفو کی جستجو

اس نے بھی آدھا کہہ دیا میرے وجود کو
میں سہہ سکوں گی اپنی یہ تذلیل کس طرح

دوسروں کے کہنے پر دستخط کیے اور پھر
عمر بھر کا اک صدمہ اختیار کر بیٹھی

میں جس کو دیکھنے کی روادار تک نہ تھی
سر اس کے سامنے بھی جھکانا پڑا مجھے

غم جاناں اردو شاعری کی قدیم ترین اور مضبوط ترین روایت ہے۔صغریٰ صدف کے ہاں بھی غم جاناں کی بہت سی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن ان کے ہاں غم دوراں کی پیش کش بھی قابل توجہ ہے۔معاشیات پر منحصر معاشرے کے معاشی مسائل اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو بھی صغریٰ صدف نے لائق توجہ جانا ہے اور ان کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ان کے ہاں جہاں سیاسی ابتری پریشانی کا باعث ہے وہیں پر حکمرانوں کی بے ضمیری اور غلامانہ سوچ بھی ان کو مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔اس کے علاوہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ایک تکلیف دہ احساس کی صورت میں سامنے آتی ہے اور وہ اس پر آنسو بہاتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف وہ قدرتی مناظر کی پامالی اور فضائی آلودگی کو بھی اپنی اقلیم قلم سے باہر نہیں نکلنے

دیتیں۔ دہشت گردی آج کے دور میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ بین الاقوامی دہشت گردی سے لے کر خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی صورت میں ملک کے اندر دہشت گردی کے عفریت کی کارروائیوں پر بھی نوحہ کناں ہیں۔ ان سب معاملات کا اظہار انہوں نے ایک باشعور اور باخبر فن کارہ کی حیثیت سے اپنی شاعری میں کیا ہے۔

پہلے قدم قدم پہ بہاروں کا راج تھا
اب خون میں نہائی ہے وادی سوات کی
زندگی صغریٰ صدف پتھرا گئی
کوئی تبدیلی نہیں حالات میں
آج کل میرے قبیلے کا ہے سردار وہی
جس نے سر غیر کی دستار میں رکھا ہوا ہے
جانے کشت جاں سے پھوٹیں کیسے کیسے حادثات
نفرتوں کا بیج پھر بویا ہوا ہے آج کل

صغریٰ صدف نے نیا طرز اظہار اپنایا ہے اور اپنے نئے فکری مضامین کو نیا فنی آہنگ اور صورت بھی دی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے گلوبلائزیشن کے زیر اثر قائم ہونے والے جدید معاشرے کے بہت سے مظاہر بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان مظاہر کی پیش کش میں جدید نقطہ نظر اور جدید طرز اظہار دونوں بیک وقت موجود ہیں۔

لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری ہر ایک بات کی

ڈاکٹر صغریٰ صدف کا بنیادی مضمون فلسفہ ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں فلسفیانہ انداز کا در آنا حیرت کا باعث نہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اشیاو مظاہر کو ایک فلسفی کی آنکھ سے دیکھنے اور ان پر غور و تدبر کرنے کے لیے بہت سے نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ ان میں غالب کی طرح کا استفہام بھی ہے اور میر کی طرح جھلاہٹ بھی ہے جو ان لوگوں کا طرز عمل دیکھ کر پیدا ہوتی ہے جو حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں یا انہیں کوئی اور رنگ دے کر لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے فلسفے کو اپنی شاعری کی زیریں سطح پر ایک موٹف (MOTIF) کی طرح مستقل طور پر رکھا ہے جو بار بار ظاہر ہو کر اپنی اہمیت کا اعلان کرتا ہے۔ اس کی علاوہ ان کی زندگی اور فن کا فلسفہ عدل پر بنیاد رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ظلم دیکھتی ہیں اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کی حمایت میں رطب اللسان مقتدر طبقوں پر سخت نکتہ چینی اور بعض اوقات طنز و تشنیع بھی کرتی ہیں۔

دن سے آگے رات سے آگے
کیا ہے موت حیات سے آگے
اے میرے مورخ تری دانائی پہ صدقے
ہر بات پہ توقیر در و بام کو لکھنا

حکیم مومن خان مومن کی طرح صغریٰ صدف نے بھی اپنے تخلص کی رعایت سے صدف اور گہر کے تعلق کو بارہا پیش کیا ہے لیکن لطف یہ ہے کہ ہر بار اس تعلق کی کوئی نئی صورت، کوئی نئی جہت، کوئی نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔ ایک ہی بات کو کئی طرح کے پیرایے میں بیان کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ بہت سے مقطعوں میں "صدف" ان کا تخلص بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اصل معانی یعنی منبع گوہر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ لفظ بیک وقت ان کی ذات کا استعارہ بھی ہے اور اور ایک خوب صورت قدرتی مظہر بھی ہے جو اپنے سوز دروں سے قطرہ نیساں کو گہر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صغریٰ صدف اور سیپ صدف میں ظاہری جمال آرائی کے ساتھ ساتھ باطنی سوز دروں کی خصوصیت بھی مشترک ہے اور یہی دونوں کو فکری طور پر ہم آہنگ بھی کرتی ہے۔ اسی لیے ایک مقام پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ صغریٰ صدف اور سیپ صدف ایک ہو جاتے ہیں۔ اکثر غزلوں کے مقطعوں کے علاوہ بارہ شعروں کی ایک غزل کی ردیف ہی "صدف" ہے۔ تصور کیجیے کہ اس میں صدف کا کون سا پہلو تشنہ رہا ہوگا۔ چند اور مثالیں دیکھیے:

مری دعاؤں میں آقا اثر عطا کر دے
صدف ہوں میں، مجھے میرا گہر عطا کر دے
بوند صدف گوہر بنتی ہے
اک بحر ظلمات سے آگے
چشم صدف میں تیر رہا ہے
تیری یاد کا ایک گہر سا
قدر و قیمت ترے گوہر کی بھلا کیا ہو صدف
اک نگینہ ہے جو دیوار میں رکھا ہوا ہے
صدف سے گہر کر دیا اس نے مجھے
میں اس کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں
میں صدف منتظر ابر گہر بار بھی ہوں
قطرہ رحمت باراں ہی اجالے مجھ کو
سوال کرتی ہے وہ چشم نیلگوں مجھ سے
گہر کو سینے میں ہے کس طرح اتارا صدف
بوند صدف گوہر بنتی ہے
اک بحر ظلمات سے آگے

الفاظ اور یادیں

محمد ممتاز راشد

بعض اوقات کوئی افسانہ، غزل مضمون یا اور کوئی تحریر پڑھتے ہوئے اچانک کوئی لفظ اس طرح چمک اُٹھتا ہے کہ ذہن میں اُس سے متعلق کوئی یاد بھی روشن ہو کر سامنے آ جاتی ہے یا پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ اس لفظ کے بارے میں کوئی شخصیت لوحِ ذہن پر اُبھر آتی ہے کہ ہاں، میں نے یہ لفظ انہی سے پہلی بار سنا تھا یا میں نے اس لفظ کے معانی انہی سے سمجھے تھے وغیرہ وغیرہ...... میرے ساتھ بھی بعض الفاظ کے حوالے سے متعدد بار ایسا ہوا ہے۔ ذیل میں ایسے ہی کچھ الفاظ اور اُن سے متعلق یادوں کا تذکرہ ہے......

صقل یا سیکل:

''صیقل'' کا لفظ میں نے بچپن ہی میں شاہ صاحب سے سیکھ لیا تھا۔ ان کا پورا نام سید محمد ایوب شاہ تھا اور وہ ہمارے موضع محمود بوٹی (باغبانپورہ لاہور) کی جامع مسجد کے خطیب اور امام تھے۔ خطبہ جمعہ کے علاوہ اکثر وہ نماز فجر کے بعد بھی لاؤڈ اسپیکر پر آدھ گھنٹہ کے لیے قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے۔ یہ 1965ء کی بات ہے۔ میں تب ساتویں میں تھا۔ غالباً ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے لفظ ''صیقل'' استعمال کیا تھا کہ فلاں اچھے عمل سے دل بالکل صیقل ہو جاتا ہے۔ پھر مثال دے کر کہا کہ جیسے قلعی کرنے سے پرانا میلا برتن چمک کر بالکل نیا لگنے لگتا ہے بالکل ویسے ہی صیقل کا عمل دل کو چمکا دیتا ہے۔ شاہ جی کا عربی تلفظ اچھا تھا۔ وہ ''ق'' کو پورے مخرج کے ساتھ ادا کرتے تھے مگر صرف تلاوت کے دوران۔ عمومی بات چیت یا تقریر میں اُن کا وہی پنجاب کے عام افراد والا تلفظ ہی تھا۔ یعنی ''ق'' کو وہ ''ک'' ہی کی طرح بولتے تھے۔ اس لیے وہ جب ''صیقل'' کہتے تو مجھے لگتا کہ وہ ''سیکل'' کہہ رہے ہیں۔ ''سائیکل'' کو پنجاب میں سہولت کے تحت ''سیکل'' ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے جب شاہ جی ''صیقل'' کہتے تو میرا دھیان ''سائیکل'' کی طرف بھی چلا جاتا تھا۔

2000ء کے لگ بھگ گلوکار ابرار احمد کا گایا ہوا یہ پوپ گانا بھی زبان زد عام رہا:

آ جاتے بہہ جا سیکل تے
آ جانی بہہ جا سیکل تے

ابرار احمد کے اسی گانے کی بنیاد پر پھر اسلام آباد کے نامور مزاحیہ شاعر سرفراز شاہد نے یہ مزاحیہ تضحیکی قطعہ بھی کہا اور کئی جگہ سنا کر خوب خوب داد وصول کی۔

اسکول دی وڈی میڈم نے
پپو نوں کٹیا اس گل تے
اوہ نکی مس نوں کہندا سی
''آ جاتے بہہ جا سیکل تے''

بحرِ ھُم (بحرِ غم) اور مغرقٌ (مغرقون)

ہمارے جامع مسجد محمود بوٹی کے خطیب سیّد محمد ایوب شاہ خطبہ جمعہ یا دیگر درسوں میں عربی، فارسی اور اُردو اشعار بھی پڑھتے تھے۔ بعض اشعار اُنھوں نے اتنی کثرت سے دہرائے کہ ہم بچوں کو حفظ ہو گئے۔ مگر ان اشعار کے مشکل الفاظ کو ہم درست صورت میں نہیں پیش کر پاتے تھے اور محض ان الفاظ کے صوتی آہنگ کے حساب سے کسی نہ کسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ مثلاً وہ یہ عربی اشعار بھی کثرت سے پڑھتے تھے:

یا رسول اللّٰہِ اُنظُر حالنا
یا حبیب اللّٰہ اِسمَع قالنا
اِنّنی ی بَحرِ ھُمٍّ مُغرَقٌ
خُذ یَدَیْ، سَھِّل لَنَا اَشکالَنا

مجھے یاد ہے کہ ان اشعار میں سے تیسرے مصرعے کے الفاظ ''بحرِھم'' کو میں صوتی ہم رنگی کی وجہ سے تب ''بحرِغم'' کے طور پر پڑھتا تھا اور ''مغرقٌ'' کو شاہ صاحب آخر میں کچھ یوں ادا کرتے تھے کہ میں اس لفظ کو ''مغرقون'' کے بطور ادا کرتا تھا۔ اسی طرح آخری مصرعے کے پہلے لفظ ''خذ'' کو شاہ صاحب ''ذال'' کے صحیح عربی تلفظ کے ساتھ یوں پڑھتے تھے کہ ''ذال'' کی آواز ''دال'' کی آواز کے مشابہ ہو جاتی تھی (یا ہمیں ایسے لگتی تھی) اور یوں ہم ''خذ'' کو ''خود'' کی طرح پڑھتے تھے۔ بارہ اگست 2013ء کو اچھرہ لاہور میں میرے ہم خالہ زاد فیاض جمیل کی اہلیہ ناہید 45 برس کی عمر میں فوت ہو گئی۔ اگلے روز عصر سے قبل ان کی قریبی ''مسجد بورے والی'' پیر غازی روڈ اچھرہ میں رسم قل کے لیے جمع ہوئے تو مسجد کے ہال میں محراب والی دیوار پر کئی آیات، اسماء اور اشعار سے مرصع آرائشی گلیزڈ ٹائیلیں لگی ہوئی دیکھیں۔ ایک

چوکھٹے میں مذکورہ بالا عربی اشعار بھی درج تھے۔ میں نے یہ پڑھتے تو فوراً حافظے میں شاہ صاحب سے سنے ہوئے یہی الفاظ ان کے مخصوص ترنم کے ساتھ اُبھر آئے اور میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ تین چار الفاظ میں نے غلط طور پر یاد کر لیے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں جیب سے کاغذ نکال کر یہ اشعار درست طور پر نوٹ کر لیے تا کہ آئندہ کے لیے درست انداز میں یاد کرلوں۔

مسجد کے اس ہال میں بیٹھے ہوئے مجھے کچھ اور یادوں نے بھی اپنی جھلکیاں دکھائیں۔ مجھے یاد آیا کہ 44 سال قبل 1969ء میں جب میں میٹرک میں تھا تو اس دور میں تین چار سال کے لیے میں اسی محلے میں اپنی بڑی خالہ کے ہاں رہا تھا اور اس مسجد میں نمازوں کی ادائیگی ہوتی تھی۔ امام و خطیب حافظ شعیب سے مذہبی وسیاسی گفتگو رہتی تھی۔ میں نے ہال کا جائزہ لیا تو اس کی تعمیرِ نو کا اندازہ ہوا۔ لمبائی کے رُخ میں یہ ہال شمال کی طرف (پیر غازی روڈ) کی سمت آٹھ نو فٹ اور مشرق کی طرف کوئی آٹھ فٹ بڑھ چکا تھا۔ صحن چھوٹا ہو چکا تھا۔ مسجد کی شرقی سمت میں امام مسجد کا چھوٹا سا حجرہ اور سیڑھیاں تھیں اب وضو خانہ وہاں تھا جو پہلے صحن میں جنوبی سمت میں گلی کی طرف تھا۔ طہارت خانے کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اب طہارت خانے مسجد کے جنوب مغربی کونے پر دکان میں بن گئی تھی جو اس وقت محمد سلیم (چیمہ) کی کریانہ شاپ تھی۔ وہ اخبار فروش بھی تھے۔ اس دور کے کسی ماہِ رمضان کے آخری عشرے میں اسی مسجد کے ہال میں مجھے اعتکاف بیٹھنے کا شرف بھی ملا جس کے دوران میں نے دو بار قرآن پاک بھی ختم کیا تھا۔

معروف شاعر، کالم نویس، مترجم اور سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

❀ محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ) / قیمت:130 روپے
❀ چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ) / قیمت: 130 روپے
❀ سرگوشیاں (شعری مجموعہ) / قیمت:180 روپے
❀ یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ) / قیمت:150 روپے
❀ محبت کے دورنگ مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم) / قیمت: 150 روپے
❀ آج کا جاپان (سفرنامہ) / قیمت:300 روپے ❀ گفتگو (انٹرویوز) / قیمت:400 روپے ❀ مکتوب جاپان (کالمز) / قیمت:400 روپے

معروف شاعر، مزاح نگار، کالم نویس، کمپیئر اور ریڈیو پروڈیوسر

ابرار ندیم

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

❀ کون دلاں دیاں جانے (پنجابی شعری مجموعہ) / قیمت:200 روپے
❀ اب بھی پھول کھلتے ہیں (شعری مجموعہ) / قیمت:200 روپے
❀ چلتے چلتے (کالمز) / قیمت:300 روپے

سیّد تجمل عباس...... شخصیت و خدمات کے آئینے میں

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

مسلمان کے لیے عشق رسولؐ سرمایہ حیات ہے۔ وہ لوگ جو تاجدار کائنات کے اُمتی سے پیار کرتے ہیں کائنات ان سے پیار کرتی ہے۔ اپنی ذات کے لیے خوشیاں حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم انسانوں میں خوشیاں تقسیم کریں۔ غنچہ حیات کی خوشبو لامحدود اس وقت ہوتی ہے جب ہم گلدستہ آل نبیؐ کی آبیاری کرتے ہیں۔ دوسروں کا دکھ اپنی ذات میں محسوس کرنے والے کبھی نہیں مرتے۔ عشق رسول ﷺ اور جذبہ خدمت انسانی کے پیکر سیّد تجمل عباس شہید (8 مارچ 1940ء سے 5 اگست 1996ء) کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی لاتعداد اور لازوال خدمات کو احاطہ تحریر میں لانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ شاعر و ادیب علی رضا نے یہ فرض قرض سمجھ کر اُتار دیا ہے۔ ان کی کتاب ''مرد خود آگاہ سید تجمل عباس...... شخصیت و خدمات کے آئینے میں'' 248 صفحات پر مشتمل ہے۔ جسے الاشراق پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا سرورق ہمدان گرافکس کا تیار کردہ ہے۔ الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور نے منتشر لفظوں کو کتاب میں یکجا کیا ہے۔ دین محمدی پریس لاہور نے اس کاغذی پیرہن کو طباعت میں ڈھالا ہے۔ جناب علی رضا مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی عرق ریزی سے تجمل عباس کے مداح ایک ہی کتاب میں اپنی اپنی کہانی سنا رہے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ تجمل عباس ایک ذات کے بجائے ایک تحریک تھے۔ نادر تصاویر نے سیّد تجمل عباس کی خدمات کو نکھار عطا کیا ہے۔ علی رضا نے حرف آغاز میں لکھا ہے:

''...... اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوگا۔ تاہم میں یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو بین المذاہب اتحاد کا اتنا بڑا داعی ہو اور ہمہ وقت اپنے کردار و عمل سے اس کا ثبوت بھی فراہم کر چکا ہو۔ ڈپٹی کمشنر اور بعد ازاں کمشنر کے عہدے پر فائز رہنے کے باوجود اپنی زندگی ایک عام آدمی کی طرح گزارے اور لوگوں سے یوں گھل مل جائے کہ وہ اسے اپنا محسوس کریں۔ میں نے اس کتاب میں ان تمام لوگوں کی تحریروں کو مرتب کر کے پیش کر دیا ہے جو کسی نہ کسی انداز اور حوالے سے شاہ صاحب سے وابستہ رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سینئر و جونیئر، بیوروکریٹس، صحافی، سماجی و فلاحی اور دیگر شخصیات، نیز وہ اہل ادب و شعر شامل ہیں جنھوں نے شاہ صاحب کو دیکھا، ان کے ساتھ وقت گزارا، ان کی شخصیت کا پوری طرح مشاہدہ کیا اور پھر اپنے دلی احساسات کو سپرد قلم کیا۔''

کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''سید تجمل عباس...... اہل ادب کی نظر میں'' جس میں سید منظور حسین ''سیّد تجمل عباس کی جمالیاتی شخصیت'' مرتضیٰ برلاس ''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'' پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید ''مرد حب آثار'' ڈاکٹر اجمل نیازی ''سید تجمل عباس ایک شخصیت ایک تحریک'' پروفیسر ریاض حسین زیدی ''سید تجمل عباس، ایک شخص طرح دار'' محمد سعید شیخ ''سید تجمل عباس کی یاد میں'' ''ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم'' پیکر کردار و عمل...... سید تجمل عباس'' پروفیسر حسن عسکری کاظمی ''سید تجمل عباس شہید'' راجا رشید محمود ''سید تجمل عباس'' ریاض احمد شاد ''جو چپ رہے گی زبان خنجر'' پروفیسر ارجمند قریشی ''یادوں کے جھروکوں سے'' قائم نقوی ''ایک سچا عاشق رسولؐ سید تجمل عباس'' ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ''صاحب فہم و ذکا سید تجمل عباس'' پروفیسر سیّد محمد اکبر ''سید تجمل عباس'' رانا ارشاد علی صدیقی ''سید تجمل عباس...... کمشنر سرگودھا ڈویژن'' سید محمد افسر ساجد ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' طالب جتوئی ''سخی سید شہید'' ممتاز عارف ''سید تجمل عباس مرحوم...... ایک ادب پرور شخصیت'' پروفیسر اکرم ناصر ''سیّد تجمل عباس...... کچھ یادیں، کچھ باتیں'' چودھری محمد اسماعیل ''سید تجمل عباس...... انسان یا فرشتہ'' ڈاکٹر آصف راز ''ہم سے قضا ہو گیا وہ شخص'' راؤ شفیق احمد ''یادان کی، لفظ میرے ادھورے'' اخلاق عاطف ''سرگودھا کے تہذیب و ادب تجمل عباد کو یاد رکھیں گے'' رشید تبسم ''درویش صفت انسان'' آفتاب کاوش ''بڑے لوگ'' ڈاکٹر رزاق شاہد ''شاہ جی'' حسن عباس ''غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست'' راجا نیر ''خیر کا سفیر'' غضنفر عباس سید ''حقیقی زندگی کا ایک اور دیومالائی کردار: سیّد تجمل عباس'' علی رضا ''سید تجمل عباس...... ایک سلسلہ یاد'' اور مختلف اہل ادب کے تاثرات شامل ہیں۔

دوسرا باب ''سیّد تجمل عباس...... ہم پیشہ اور ہم نشینوں کی نگاہ میں'' ہے اس دوسرے باب میں سیّد

مینو چہر ''اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو'' چودھری نور یز شکور خان ''میرا دوست سید تجمل عباس'' میاں محمد صدیق کامیانہ ''سید تجمل عباس مرحوم و مغفور'' چودھری محمد رفیق ''سید تجمل عباس (مرحوم) سابق ڈپٹی کمشنر ساہیوال'' ایس ایم زیدی ''رفتید و لے نہ از دل ما'' میاں عمران الحق ''سید تجمل عباس، خوبیوں کا پیکر'' تیر اقبال ''تجمل عباس مرحوم، ایک ہمہ جہت شخصیت'' شفاعت رسول اعوان ''منارِ عظمت انسانی'' اور محمد بوٹا انور ''سید تجمل عباس، عظمت کی تصویر'' ایسے مضامین شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا باب بعنوان ''سید تجمل عباس...... کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' میں چار مضامین شامل ہیں۔ سید منظور الکونین ''سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں'' غلام فرید شوکت ''سید تجمل عباس ایک منفرد بیوروکریٹ'' ندیم عباس اشرف ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' اور خالد نجیب خان کا مضمون ''وہ میرے ڈی سی صاحب'' شامل ہیں۔

باب چہارم میں ''سید تجمل عباس...... عزیز و اقارب کی نظر میں'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں سینئر سید دلاور عباس ''میرے بھائی...... سید تجمل عباس'' سید محمد علی عباس ''میرے والد'' اور طاہر ناصر علی ''فرد نایاب، سید تجمل عباس'' کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

باب پنجم ''سید تجمل عباس...... منظوم خراج عقیدت'' میں میں معروف شعراء کا منظوم خراج عقیدت شامل کیا گیا جن میں جعفر شیرازی، قیصر بارہوی، منظور حسین یاد، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، اثر ترابی، ڈاکٹر کاظم بخاری، فرخ راجا، اکرم ناصر، پروفیسر میاں محمد مرغوب، خالد علیم، ڈاکٹر آصف راز، ذکاء اللہ انجم ملغانی، رشید تبسم، ایز د عزیز، طاہر ناصر علی، جمشید چشتی، امداد حسین طاہر، واصف سجاد، ندیم عباس اشرف، علی رضا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں سید تجمل عباس کا ایک یادگار انٹرویو جو علی رضا نے لیا وہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ پندرہ روزہ ''پاک جمہوریت'' لاہور 5 تا 19 فروری کو شائع ہوا تھا۔ اسی طرح علی رضا کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' 19 اگست 1997ء کو شائع ہوا اسے اس کتاب کی زینت بھی بنایا گیا ہے۔

معروف اہل قلم کا ایک بڑی تعداد میں مضامین اور منظوم خراج تحسین دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سید تجمل عباس کوئی علمی و ادبی شخصیت تھے۔ سید تجمل عباس کی شخصیت ہی ایسی تھی انھوں نے ہمیشہ ادباء و شعراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کو ان کا جائز مقام دیا۔ شعراء کرام سے وہ بے پناہ محبت کرتے۔ سرگودھا میں بھی ان کی کئی یادگار تقریبات آج بھی مجھے یاد آ رہی ہیں جن میں کل پاکستان محفل مشاعرہ، کل پاکستان نعتیہ مشاعرہ اور دیگر تقریبات شامل ہیں۔ ان تقریبات میں سید تجمل عباس نہ صرف خود شامل ہوتے بلکہ جوش کا کلام بھی بڑے جوش و جذبے کے ساتھ سناتے۔ سید تجمل عباس کو ان کے سینکڑوں شعر ازبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر مضامین اور منظوم خراج عقیدت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمی و ادبی حلقوں میں کس قدر مقبول اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر خورشید رضوی، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر ریاض مجید، جاوید قریشی، مرتضیٰ برلاس، سید محمد افسر ساجد، محمد سعید شیخ، ڈاکٹر اجمل نیازی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، پروفیسر ریاض حسین زیدی اور راقم الحروف (ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم) کی قیمتی رائے بھی شامل کتاب ہے۔

کتاب 80 گرام کے آفسٹ 248 صفحات پر مشتمل ہے۔ انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق پر سید تجمل عباس کی تصویر نمایاں ہے۔ الاشراق پبلی کیشنز نے کتاب کو انتہائی خوبصورت انداز میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ علی رضا نے ایک مرد قلندر اور عاشق رسولؐ سید تجمل عباس کی شخصیت اور خدمات کو زبردست انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے انتہائی عرق ریزی سے تمام مضامین کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ بعض دوستوں سے رابطے کر کے نئے مضامین لکھوائے اور یوں ان کا یہ کارنامہ نہ صرف شہید کے لیے ان کی محبت کا اظہار ہے بلکہ ایک عہد کی تاریخ لفظوں کی زبانی دوسروں تک پہنچانے کی کامیاب کاوش ہے۔ ''مرد خود آگاہ'' کی خودی اور دوسروں کے لیے خدمت کرنے کا جذبہ بے خودی کتاب کی روح ہے۔ سید تجمل عباس جہاں لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں وہاں اس کتاب کے صفحات سے ان کے کارناموں کی خوشبو ہمیشہ قائم دائم رہے گی۔ علی رضا نے جس تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش اور قابل تقلید ہے۔ جناب افتخار مجاز کی صحبت کا اثر ان کی نفاست اور فراست کی صورت نظر آ رہا ہے۔ سید تجمل عباس کے بارے میں ان تمام مضامین اور منظوم خراج عقیدت کو ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں محفوظ کر کے گویا ایک تاریخ رقم کر دی ہے۔ اس کتاب کا نہ صرف خیر مقدم کیا جائے گا بلکہ علی رضا کی فکری و فنی صلاحیتوں کا اعتراف بھی یقیناً ساتھ ساتھ رہے گا۔

ضمیر کی تلاش

عطاء الحق قاسمی

سید ضمیر جعفری کو اسلام آباد فون کرنے کیلئے میں نے نمبر گھمایا۔ دوسری طرف سے ریسور اٹھائے جانے پر میں نے کہا "ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"ضمیر؟ کون سا ضمیر؟ یہ ایک پولیس افسر کا گھر ہے۔" اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے دوسری دفعہ نمبر گھمایا "ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"بھائی صاحب آپ گھاس تو نہیں چر گئے؟ یہ ایک بزنس مین کا گھر ہے یہاں کوئی ضمیر و میر نہیں ہے!"

اب کے میں نے ڈرتے ڈرتے نمبر گھمایا اور دل میں دعا کی یا خدا ضمیر صاحب سے بات ہو جائے۔ اس دفعہ ایک عالم دین نے فون اٹھایا "لاحول والا ایک تو رانگ نمبروں نے تنگ کیا ہوا ہے۔ ارے میاں یہاں ضمیر کہاں سے آ گیا؟ یہ مولوی سرکار علی کا گھر ہے!"

اگلی دفعہ نمبر ایک صحافی کے ہاں جا ملا "میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ نمبر غلطی سے نہیں ملا آپ لوگ ضمیر ضمیر کی دہائی دے کر چاہتے ہیں کہ ہم لوگ بھوکے مر جائیں! اگر آپ نے آئندہ فون کیا، تو مجھے پولیس کو رپورٹ درج کرانا پڑے گی"

میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

میں نے سوچا لائن میں خرابی ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ دیر انتظار کر کے فون کرنا چاہیے۔ چنانچہ قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون ملایا۔

"ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"جی ہاں ہیں! فرمایئے"

"جی ذرا ان سے بات کرنا چاہتا ہوں!"

"بھائی ضمیر کی باتیں اس طرح فون پر طے نہیں ہوا کرتیں۔ آپ کبھی گھر تشریف لایئے۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں"

"سر میں کالعدم...... پارٹی کا راہنما بول رہا ہوں۔ آپ کی آواز خوب پہچانتا ہوں، آپ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے بول رہے ہیں نا؟"

"جی...... جی......" اور اس کے ساتھ ہی میں نے فون اس طرح بند کر دیا جیسے اچانک منقطع ہو گیا ہو!

اگلی دفعہ ایک صاحب اقتدار کے ہاں جا ملا

"ضمیر صاحب ہیں؟"

"آپ کو آج ضمیر کی یاد کیسے آ گئی؟"

میں بہت خوش ہوا کہ اس دفعہ نمبر صحیح مل گیا ہے۔ "ہم اپنے ضمیر کو بھولے تو کبھی نہیں، البتہ اس دوران دنیاداری کے دھندوں سے فرصت نہیں ملی!"

"تو جہاں اتنے برس دنیا داری کے دھندوں میں آپ کو ضمیر یاد نہیں آیا مزید آئندہ کچھ عرصہ اس بے چارے کو زحمت نہ دیں!"

"یہ سن کر میں چونکا...... گویا دوسری طرف ضمیر صاحب نہیں ہیں" "آپ ضمیر صاحب ہیں؟"

"دیکھو میاں! یہاں کوئی ضمیر نہیں ہے۔ اگر تم کوئی سیاسی آدمی ہو تو کھل کر بات کرو، ورنہ بند کر دو، یہ رانگ نمبر ہے"

اور پھر رانگ نمبر پر میں نے انکم ٹیکس، ایکسائز، بلدیہ، ہسپتال، تعلیم اور اللہ جانے کن کن شعبوں کے افراد سے بات کی۔ ایک پیر صاحب سے بھی بات ہوئی مگر ہر ایک نے ضمیر کا سن کر ٹیلی فون بند کر دیا اس دوران میں نے ایک نسوانی آواز بھی سنی۔

"آپ ہم پر طنز کر رہے ہیں؟ ہم آپ لوگوں سے زیادہ باضمیر ہیں۔ ہم لوگ رشوت نہیں لیتے، چوری نہیں کرتے، سمگلنگ نہیں کرتے، یہ سب کچھ تو آپ لوگ کرتے ہیں اور پھر ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم تو نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔ درگاہوں پر بھی جاتے ہیں۔ محرم کا بھی احترام کرتے ہیں۔ آپ لوگ کیا ہیں؟ ضمیر...... ضمیر؟ جب کسی کی جیب میں پیسہ نہ ہو، وہ ہمارے ساتھ ضمیر ہی کی بات کرتا ہے۔ مفت کے چسکے لیتے رہتے ہیں۔ بند کرو فون یہ گاہکی کا وقت ہے!"

اس صورت حال سے پریشان ہو کر میں نے سوچا کہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بجائے اسلام آباد میں ڈاکٹر صفدر محمود کو فون کر کے کہنا چاہیے کہ وہ فون کر کے ضمیر صاحب کو میرا پیغام پہنچا دیں اور انہیں کہیں کہ اگر ہو سکے تو وہ مجھے لاہور فون کر لیں۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ساری داستان سنائی۔

"اب تم اندر کی بات بتاؤ" ڈاکٹر صفدر محمود نے آخر میں کہا

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ ضمیر کی تلاش کا خیال تمہیں کیونکر آیا؟ بھولی ہوئی چیز انسان کو ایسے ہی یاد نہیں آیا کرتی!" ڈاکٹر صفدر محمود نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر فون درمیان میں منقطع ہو گیا!

تھوڑی دیر بعد میرے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سید ضمیر جعفری تھے صفدر محمود نے انہیں میرا پیغام دے دیا تھا میں نے انہیں بھی پوری کتھا سنائی۔ اس پر وہ ہنسے اور پھر بولے'' تمہارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے تھا''

''اس لئے کہ ہم سب لوگ ضمیر کی باتیں بہت کرتے ہیں مگر اس کے لئے کوئی قربانی نہیں دیتے۔ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو!''

''میں تو قربانی دیتا ہوں''

''ہاں بقرعید پر دیتے ہو۔ پچھلے سال تم نے ایک ران مجھے بھی اسلام آباد بھجوائی تھی!''

تب میں نے سوچا کہ یہ بزرگ تو میرے احوال سے پوری طرح واقف ہیں لہذا ان سے سیدھی بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے کہا

''ضمیر کی بات تو میں ایسے ہی فیشن کے طور پر کر رہا تھا ورنہ یہ ضمیر وغیرہ سب معروضی اصطلاحات ہیں''

''ہاں! اب تم راہ راست پر آئے ہو مگر آخر میں ایک بات تو بتاؤ!''

''پوچھئے''

''یہ تم بیٹھے بٹھائے ضمیر کے خلاف کیوں ہو گئے ہو؟''

''اس کی صرف ایک وجہ ہے'' میں نے کہا'' اور وہ یہ کہ ضمیر انسان کو برے کاموں سے نہیں روکتا صرف ان برے کاموں کا مزا کرکرا کرتا ہے۔ فون پر جتنے لوگوں سے بھی میری بات ہوئی وہ پورے تواتر سے برے کام کرتے رہتے ہیں بس درمیان درمیان میں ضمیر ان کا مزا کرکرا کرتا رہتا ہے۔ اب رنگ میں بھنگ ڈالنے والی اس بے معنی سی چیز کے دفاع میں کیا بولا جائے؟''

نامور کالم نویس، مزاح نگار، شاعر، سفرنامہ نگار اور ڈرامہ نویس

عطاء الحق قاسمی

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

❀ مجموعہ/ قیمت:1200روپے ❀ ہنسنا رونا منع ہے/ قیمت400روپے ❀ بلبلے/ قیمت:200روپے
❀ وصیت نامے/ قیمت:300روپے ❀ دلی دور است/ قیمت: 250روپے ❀ شوق آوارگی/ قیمت:400روپے
❀ دنیا خوبصورت ہے/ قیمت: 300روپے ❀ بارہ سنگھے/ قیمت:500روپے ❀ جرم ظریفی/ قیمت: 500روپے
❀ خندِ مکرر/ قیمت: 450روپے ❀ ڈھول ڈھپا/ قیمت: 500روپے ❀ آپ بھی شرمسار ہو/ قیمت: 400روپے
❀ مزید گنجے فرشتے/ قیمت: 400روپے ❀ شرگوشیاں/ قیمت: 400روپے ❀ ملاقاتیں ادھوری ہیں/ قیمت:350روپے
❀ عطاء الحق قاسمی شاداب موسموں کی آواز/ قیمت350روپے ❀ روزنِ دیوار سے/ قیمت: 500روپے

ناشر:

نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 042-7351963

عوامی صدر، عوامی ادیب اور عوامی چور

حافظ مظفر محسن

"مظفر غور کیا......؟" اُستاد کمر کمانی نے مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولے۔

"کیا؟"

"حضور ہر مہینے کی بیس تاریخ کے بعد پوری قوم غور کرنا شروع کر دیتی ہے۔ سوچنے لگتی ہے کہ پٹرول کے نرخ کدھر جائیں گے...... "ارے جاہل" یہ سوچنا اب مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

یہ سوچنا چھوڑ دو...... سرتاج عزیز ہیں ناں؟...... اور اسحاق ڈار؟۔ ہاں ہاں وہ بھی!...... مٹی کا تیل کہاں آگ لگائے گا؟ کمر کمانی نے معنی خیز نظروں سے دیکھا...... قوم کو بجلی کے بل میں ڈالے سرچارج آج بھی یاد ہیں۔

"سرتاج عزیز سے قوم بھر خیر کی توقع کیے بیٹھی ہے؟"

"غور یہ کرو کہ تمہارا صدر اس وقت عوامی صدر ہے یا نہیں؟"

واقعی میں نے غور کرنا شروع کیا۔ آج کی خبر نے اس بات کو مضبوطی عطا کر دی ہے کہ "صدر ممنون حسین کے عزیز کی دوکان پر بھتہ خوروں کی فائرنگ!" قوم نے جب اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہوگی تو صبح صبح ٹیلی ویژن دیکھنے والی خواتین کی چیخیں نکل گئی ہوں گی۔ (ویسے بھی وہ ترکی کی دلکش ہیروئنیں دیکھ دیکھ کر چیخ رہی ہیں۔ اس عوامی یلغار کے آگے بس بس۔"

"عوامی صدر"...... عوامی کرائم کرنے والوں کے سامنے ہیں۔ اب بھلا...... "عوامی صدر" کس سے علاقے کے ایس ایچ او کو سفارشی فون کروائے یا پھر چپ رہے؟ مجھے چوہدری فضل الٰہی آف گجرات المعروف صدر فضل الٰہی چوہدری یاد آ گئے!

میں نے حسب معمول داد دی...... اُستاد کمر کمانی کو...... کہ دور کی کوڑی لانے میں وہ بلاشبہ ماہر ہیں۔

اس بار نواز شریف نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف اُٹھایا تو مجھے دوستوں کے فون آئے...... "سنا ہے تمہارے عطاء الحق قاسمی صاحب اس بار سفارت نہیں گورنری کے مزے لوٹیں گے؟" لوگ سمجھتے رہے کہ شاید عطاء الحق قاسمی کالم محض کسی لالچ میں لکھتے رہے۔ حالانکہ دورِ مشرف میں سچ لکھنا اور سچ کہنا بھی اسی طرح مشکل تھا جیسے ضیاء الحق کے دور میں! (عوامی ادیب بلاخوف و خطر حق سچ بولتا ہے...... سزا اجزاء سامنے نہیں ہوتی)۔

مجھے تھوڑا غصہ آ گیا...... سوال کرنے والا سینئر صحافی اور زیرک لکھاری بھی تھا۔

میں نے بتایا کہ "جنگ اور امن" جیسے تاریخی ناول کا خالق نامور روسی لکھاری لیوٹالسٹائی...... اس وقت کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا۔ اس کے گھر کے سینکڑوں کمرے تھے اور دوسری شاہانہ خوبیاں اس کے علاوہ تھیں۔ اُس مالدار ترین شخص کی شہرت اُس کے کروڑوں روبلز کے نیچے دب جاتی...... اگر وہ ناول نگار نہ ہوتا!

لیوٹالسٹائی نے بہت سے ناول لکھے جو سب نہایت شوق سے پڑھے گئے۔ اُن پر فلمیں بنائی گئیں اور دنیا بھر کے چند ایک مستند لکھاریوں میں ہمیشہ لیوٹالسٹائی کا نام آتا ہے۔ کیا وہ زار کی حکومت میں کسی ریاست کا گورنر تھا یا اُس کے باپ دادا، کس قدر مالدار لوگ تھے۔ کسی پڑھنے والے کو محض اس سے غرض رہے گی کہ لیوٹالسٹائی "جنگ اور امن" جیسے عظیم ناول کا خالق تھا۔ کیا چیخوف، برنارڈ شاہ یا برٹرنیڈ رسل امیر ترین لوگ تھے یا بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ہرگز نہیں...... وہ بڑے...... بہت بڑے لکھاری تھے اور آج تاریخ کا حصہ ہیں۔

میں ذرا لمبی گفتگو کرنے کا عادی ہوں اسی لیے عام طور پر لوگ میری آدھی بات سن کر منہ دوسری طرف موڑ لیتے ہیں باقی کی گفتگو کو بے مقصد...... سمع خراشی سمجھتے ہوئے۔

سوال کرنے والے نے بھی منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میرا ذہن عطاء الحق قاسمی کی اُن سات عوامی کتابوں کی طرف چلا گیا جو حسن عباسی کے ادارے "نستعلیق" نے حال ہی میں 'قوس قزح' کی طرح نہایت خوبصورت انداز میں شائع کی ہیں۔

اعوان صاحب سے کل رات چائے پر ملاقات ہوئی تو اپنی عادت کے مطابق بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے...... جو یہ "بے قابو قہقہے لگا رہے ہیں۔" اعوان صاحب کے دل میں بات بائیس منٹ تک رہ سکتی ہے۔ چوبیسویں منٹ پر بات خود بخود اُگل دیتے ہیں یا کمر پر مشکل سے خارش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جسم ماشاءاللہ اس قدر پھیلاؤ کا شکار ہے کہ اپنے دائیں بائیں دونوں ہاتھوں سے کوشش کر بھی لیں خارش کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں کیا کرتے

ہیں میں نہیں بتاسکتا۔ "بری بات" (کہ خارش کرنا چاہو اور کر نہ پاؤ..... آتی ہوئی چھینک..... آتے آتے رک جائے...... اور ایس ایچ او کو ایماندار آفیسر کے ساتھ کھانا پڑ جائے "طبیعت بھاری پن" تو محسوس کرتی ہے ناں!...... اس حال میں موصوف کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا!

یا پھر انجانے میں سویٹ ڈش پر لیموں نچوڑ کر نان کے ساتھ کھیر کھانے لگتے ہیں۔

اعوان صاحب..... بات بتا کے خود کو پلیز نارمل کریں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے نان..... جو کھیر کے ساتھ کھایا جا رہا تھا..... پکڑ کر درخواست کر دی۔

"مظفر.....کل شام میں گھر گیا..... راستے میں گاڑی خراب ہونے کے باعث بار بار ٹھیک کرنے کی وجہ سے ہاتھ گندے تھے۔ میں ہاتھ دھونے کے لیے ٹونٹی کھولنے لگا۔ تو سیدھا پانی میرے کپڑا پر گرا۔ میں بلا خواہش نہا گیا۔ صبح تو گھر میں، میں ٹونٹی چھوڑ کر گیا تھا۔ سب نلکے ٹھیک تھے۔

میں نے سارے گھر کا چکر لگایا۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی مگر واش روم میں، کچن میں..... کہیں بھی پورے گھر میں کوئی ٹونٹی موجود نہ تھی۔ میں سوچنے لگا..... اور مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہوئی..... اس عوامی دور میں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں بھتہ مانگنے والے صدر ممنون حسین کے قریبی عزیز کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بینکوں کو لوٹنے والے دندناتے پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عوامی صدر کے دور میں عوامی چور بھی پوری طرح "ایکٹو" ہیں۔ مسجدوں سے جوتیاں چرانے والے بھی اپنے "کاروبار" میں مصروف..... یہاں تک کہ اعوان صاحب کے گھر سے ساری ٹونٹیاں چرانے والے بھی..... ہر گلی محلہ میں موجود ہیں۔ "یہ تھی نئے عوامی دور کی عوامی کہانی؟"

خیالوں میں ہے روشن سبز گنبد — میں گھر بیٹھے زیارت کر رہا ہوں

ساہیوال میں مقیم نعت اور غزل کے معروف شاعر علی رضا کا نعتیہ مجموعہ

ثنائے سرور ﷺ

ڈاکٹر خورشید رضوی، احسان اکبر، ڈاکٹر ریاض مجید، خالد علیم اور مظفر حسن منصور، راجہ رشید محمود اور ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ کی آراء کے ساتھ

نہایت دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے

صفحات: 170 — ملنے کا پتہ: — قیمت: 300 روپے

نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 042-7351963

کینیڈا میں مقیم اُردو اور پنجابی کی معروف شاعرہ تن دیپ تمنا کا اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ

"پہلا گیت محبت کا"

خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے

نستعلیق مطبوعات

F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار،

لاہور 042-7351963

نیویارک امریکہ میں مقیم پنجابی کے نامور شاعر سرندر سوہل کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ

شیشے تے کھِڑدے پھُل

خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے

نستعلیق مطبوعات

F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار،

لاہور 042-7351963

متفرق شاعری

ہر ایک شخص کو بے آسرا نہ سمجھا کر
خدا کو صرف تو اپنا خدا نہ سمجھا کر
جگر کے داغ نظر کے چراغ ذہن کی لو
بدن میں ایک ہی روشن دیا نہ سمجھا کر
دلوں کا قرب مقدم ہے چاہتوں کے لیے
نظر کے فاصلے کو فاصلہ نہ سمجھا کر
میں اپنی خواہشیں محدود کر کے جی لوں گا
تو اپنے آپ کو میرا خدا نہ سمجھا کر
غم والم بھی ضروری ہیں زندگی کے لیے
غم و الم کو تو ناقص غذا نہ سمجھا کر
حسین چہرے کو چہرہ سمجھ بجائے قمر
سیاہ زلف کو کالی گھٹا نہ سمجھا کر
یہ شاعرانہ تعلی بھی خود فریبی ہے
جفا و جور کو مہر و وفا نہ سمجھا کر
محبتوں کا صلہ نفرتیں نہیں ہوتا
ہمارے پیار کو اتنا برا نہ سمجھا کر
مزاج وقت تغیر پسند ہے نصرتؔ
کسی بھی لمحہ کو ٹھہرا ہوا نہ سمجھا کر

نصرت صدیقی/فیصل آباد

خواہش (سانیٹ)

گل تہذیب غارت ہے
ہر اک ترتیب غارت ہے
قبا صد چاک اڑتی ہے
چمن میں خاک اڑتی ہے
ہوئی مفقود بیداری
نہیں ہے دوستی یاری
کسی نے گن نہیں گائے
پرندے بھی نہیں آئے
ہوئی درپیش مجبوری
نگاہوں میں ہے بے نوری
غرض بیمار آنکھوں سی
یہی خواہش ہے نرگس کی
کہ ہو دست ہنر پیدا
کوئی ہو دیدہ ور پیدا

آصف ثاقب

دوہے

اپنی نگری چھوڑ کر جائے دیس پرائے
پتہ ٹوٹے پیڑ سے مڑ کر پھر نہ آئے
نہ پریاں نہ تال تھا ٹوٹا سندر خواب
صحرا اڑتی ریت تھی بھیتر لاکھ سراب
راہی سارے چل دیے ویرانی کے سائے
اب نہ کوئی آئے گا سونی رین سرائے
مت جا نا ری باوری سن لے میری بات
گھور اندھیرے راستے رات لگائے گھات
خار بھرے ہیں راستے تو ہے نازک پھول
ننگے پاؤں سندری چبھ جائیں گے سول
راہیں لپٹی دھول میں نیناں نیناں چھار
دھندلائی ہیں منزلیں دھملائے آثار
کوئی نہ پہچانتا گاؤں نہ گھر بار
اب تو میرا نام بھی بھولے میرے یار

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

اُکتاہٹ

آج مری مجبوری مجھ کو
کس دوراہے پر لائی ہے
پیچھے بھاگ نہیں سکتا میں
آگے جانا بھی مشکل ہے
سایہ بڑھتا ہی جاتا ہے
وقت گزرتا ہی جاتا ہے
میں طوفانوں کا متوالا
سب کا ساتھ نبھانے والا
گردش وقت میں آن گھرا ہوں
دن یا رات کا میں مہماں ہوں
غم مجھ سے بیزار ہوا ہے
میں غم سے بیزار نہیں ہوں
میری حالت اب ایسی ہے
جیسے اک بجلی کا کھمبا
تاروں کا جھرمٹ کا قیدی
تنہا وقت گزار رہا ہو

آفتاب راجا

یہ کیسا دیوانہ پن ہے

دور نہیں وہ میرے قریں ہے
یاد اُس کی دل کی تسکیں ہے

متفرق شاعری

میں نے کب اُس کو دیکھا تھا
کس دن اُس سے پیار ہوا تھا
اب بھی وقت کے اس آنگن میں
ارمانوں کے پھول کھلے ہیں
ہجر کی ان کالی راتوں میں
اُس کی یاد کے دیپ جلے ہیں
میری آنکھیں میرے سپنے
اب بھی اس کو ڈھونڈ رہے ہیں
میری محبت جاگ اُٹھی ہے
مجھ کو نیند نہیں آتی ہے
ہر آہٹ پر چونک اُٹھتا ہوں
دھیرے دھیرے بول اُٹھتا ہوں
وہ دن جانے کب آئے گا
جب وہ مجھ سے آن ملے گا
دیکھ کے اک دوجے کو پھر ہم
گھبرائیں گے شرمائیں گے
آنکھوں ہی آنکھوں میں دونو
بس یہ سوچ کے رہ جائیں گے
دل میں اب تک ایک چبھن ہے
یہ کیسا دیوانہ پن ہے

آفتاب راجا

خوشبو کی طرح ملتا ہے، وعدہ نہیں کرتا
موسم کا پرندہ ہے، ٹھکانہ نہیں کرتا
وہ پچھلی محبت میں، مرے دل کا خسارہ
اسبابِ دروں وہ کبھی پوچھا نہیں کرتا
کرتا ہے ہر اک رنگ کی چڑیوں سے وہ باتیں
پہنائی میں دل کی، کبھی اُترا نہیں کرتا
اس شہر میں جینے کی ادا سیکھ رہی ہوں
بیتے ہوئے کل پہ، یہ گزرا نہیں کرتا
وہ عشق میں شعلوں کا طلب گار ہے لیکن
اس آگ میں مر جانے کا سودا نہیں کرتا

فرحت زاہد/لاہور

تھکن سے چور ہیں اور گرد سے اَٹے ہیں ہم
نظر اُٹھا کہ تری سمت دیکھتے ہیں ہم
وہی چراغ، وہی میں، وہی فسوں تیرا
ہر ایک بار یونہی تجھ کو چاہتے ہیں ہم
ترے خیال کی خوشبو اداس کرتی ہے
ترے سراب کی وادی میں گونجتے ہیں ہم
یہ اور بات، ترے ساتھ دن گزرتا ہے
یہ اور بات، تری نیند میں رہے ہیں ہم
کبھی کبھی تو یوں رستے میں شام ہوتی ہے
کہ حوصلوں کی طرح خود میں ٹوٹتے ہیں ہم

فرحت زاہد/لاہور

ابھی تک وہ مری آنکھ میں جمی ہوئی ہے
جو تیرے گھر پہ ملاقات آخری ہوئی ہے
عجب سکوت کا عالم ٹھہر گیا مجھ میں
زیادہ بات بنی ہے نہ کچھ کمی ہوئی ہے
شکستہ ہوتی ہوں دن میں نہ جانے کتنی بار
دُعا ساتھ ہے کہ بات کچھ بنی ہوئی ہے
کھڑی ہوئی تھی نہ جانے میں کتنی مدت سے
صدا بلند ہوئی ہے تو حاضری ہوئی ہے
زیاں سکون کا اچھا ہے صوفیہ بیدار
شگون اچھا ہے جو دل میں بے کلی ہوئی ہے

صوفیہ بیدار/لاہور

رہِ کمال میں ایسا خلاء ضروری ہے
کمی ہے جو بھی مری ذات میں وہ پوری ہے
یہ رسم عشق ہے بس خود کو تھام رکھا ہے
مٹانا چاہوں تو بس دو قدم کی دوری ہے
گزار لیتا ہے وہ بھی تو اب بغیر مرے
تو میرے دل کی بھی اب کیفیت عبوری ہے
ہوئی ہے خاک محبت بلا کی وحشت سے
ہمارے درمیاں ارض و سما کی دوری ہے
بھلا ہو کیسے مکمل یہ زندگی کا جلاء
مراد دل کی کوئی صوفیہ ادھوری ہے

صوفیہ بیدار/لاہور

ٹوٹ جانے پہ بھی خفا نہ ہوئے
عکس اور آئنہ جدا نہ ہوئے
گھر کے افراد ساتھ رہ کر بھی
ایک دوجے سے آشنا نہ ہوئے
جانبِ منزلِ صدائے دل
چھوڑ کر سائباں روانہ ہوئے
سانس کے ساتھ سانس لیتے لوگ
دیکھتے دیکھتے فسانہ ہوئے

وقت نے زاویے بدل ڈالے
جو نشانی تھے وہ نشانہ ہوئے
سالہا سال ہو چکے ہیں میاں
اس گلی میں مرا ٹھکانہ ہوئے
ابن آدم تھے اس لیے آکاشؔ
خواہشوں سے گریز پا نہ ہوئے
احمد سبحانی آکاش/لاہور

کھولتے کھولتے جو دھیان کھلا
ہر نظر اک نیا جہان کھلا
ہر طرف راستے نکل آئے
آنکھ پر ایسے آسمان کھلا
سبزہ و گل نمو پذیر ہوئے
نم ہوا تب یہ خاک دان کھلا
باندھ رکھا تھا اُس نے خود کو مگر
میری دعوت پہ میزبان کھلا
خوف آتا ہے جھانکتے جس میں
بعد مدت کے یہ مکان کھلا
ذکر آیا جہاں جہاں اُس کا
اجنبیت میں رازدان کھلا
ہم کہیں بھی نہیں گئے آکاشؔ
ختم ہوتے ہی داستان کھلا
احمد سبحانی آکاش/لاہور

درد کی شام ٹل بھی سکتی ہے
زندگی رُخ بدل بھی سکتی ہے
وہ گریزاں ہے ان دنوں مجھ سے
میری خاطر مچل بھی سکتی ہے
کیا ضروری ہے مفلسی ہی رہے
میری قسمت بدل بھی سکتی ہے
اپنی اس روشنی پہ ناز نہ کر
چاندنی رات ڈھل بھی سکتی ہے
وہ اگر اک نظر ادھر کر دے
دل کی حالت سنبھل بھی سکتی ہے
ہم فقیروں کو کیوں ملے مٹی
دھرتی سونا اُگل بھی سکتی ہے
تیرے گھر آفتابؔ آئے گا
برف آخر پگھل بھی سکتی ہے
آفتاب خان/لاہور

میں تو تیری لاڈلی تھی

کیسا دن اور کیسا لمحہ آیا ہے
جس نے مجھے برباد کیا
میرے ہنستے بستے جیون کو
ناشاد کیا
پھول سی گڑیا کو تو دیکھو
اک وحشی نے کیسے نوچا
وہ تو اک معصوم پری تھی
سرتاپا رحمت تھی وہ
کتنی چیخی چلائی ہوگی
معصومہ کی
جان لبوں تک آئی ہوگی
لیکن وہ انسان نہیں تھا
اک درندہ تھا
اتنے درندے
میرے شہر میں آئے کیسے
یہ تو ان کا مسکن نہیں ہے
ہم سب بیٹیوں والے ہیں
جانے کس نے اس کی عزت لوٹی ہے
اک بیٹی کی قسمت پھوٹی ہے
لرزہ سا اک طاری ہے
اک اک لمحہ بھاری ہے
جان کنی کے عالم میں
وحشت زدہ آنکھوں سے وہ
مجھ سے پوچھ رہی ہے
بابا میرا جرم ہے کیا
زخموں سے کوئی چور ہوئی
کیوں اتنی رنجور ہوئی
میں تو تیری لاڈلی تھی
میں تو تیری لاڈلی تھی
نازاوکاڑوی/لاہور

وقت مہلت عطا کرے کب تک
اپنی قسمت سے بھاگتے کب تک
گرتے پیڑوں کی زد میں ہیں ہم لوگ
کیا خبر راستہ کھلے کب تک
میں نہ ہوتا تو کیا خبر ہوتی
رات جلتے رہے دیے کب تک
سارا منظر نظر کے سامنے ہے
نظر آتا ہے دیکھئے کب تک
عرصہ زندگی شمار نہ کر
صرف یہ دیکھ ہم جئے کب تک
موڑ درکار ہے کہانی کو
کوئی اس تار پر چلے کب تک

تم تو باز آ گئے ستم سے مگر
زخم کیا کیا پتہ بھرے کب تک
اظہر فراغ/بہاولپور

خود سے ملنے کا اہتمام کیا
رات خود سے بہت کلام کیا
جن کے نیچے بزرگ بیٹھے تھے
ان درختوں کا احترام کیا
طشت میں پھول رکھنے سے پہلے
تیغ کو میں نے بے نیام کیا
بوسہ اس کی جبین پر چھوڑا
پھر اسے آخری سلام کیا
عشق کارِ ثواب ہے بے شک
اس نے جینا مرا حرام کیا
مبشر بلوچ/بھکر

سنا ہے برف سے سورج نمک سے گھر بناتا ہے
وہ دیوانہ مصور ہے ہوا کے پر بناتا ہے
حصارِ چشم میں رہ کر بھی وہ میرا نہیں ہوتا
میں آئینے سجاتی ہوں تو وہ پتھر بناتا ہے
بہت ہنستا ہے وہ جب بھی کسی پرلطف محفل میں
اُسی دن سارے کاغذ پر وہ چشمِ تر بناتا ہے
فصیلِ ذات میں اپنی کوئی روزن نہیں رکھتا
نظر سے دل میں جانے کے لیے اک در بناتا ہے
کسی صورت نہیں ہوتا تکلم پر وہ آمادہ
بہت میں ضد کروں تو لب پہ اک نشتر بناتا ہے
مبشر بلوچ/بھکر

اک سبزۂ رُخسار پہ زنجیر لکھی ہے
سورج سے مرے عشق کی تقدیر لکھی ہے
سایہ ترے اجیالوں کا محرابی لگے ہے
اور چاندنی کے حسن ترے ہیر لکھی ہے
آوارگیٔ ساعت لب زاد میں اُتری
اس گاؤں کی سڑکوں پہ سخن گیر لکھی ہے
پانی میں گلابوں کے ڈبو کر تری پلکیں
لکھی ہے غزل اور بہ تاثیر لکھی ہے
اس شہر سے آتی ہوئی بادِ نم خستہ
ہونٹوں پہ لیے آس کی تعزیر لکھی ہے
اب گھاس کی ڈالوں پہ میں مشکیزہ لکھوں گا
خشکی کے جزیروں مری تصویر لکھی ہے
دم ساز مسافت کسی کشتی میں جلی تھی
مشعل کو ڈبو منزلِ رہگیر لکھی ہے
ہاتھوں میں لیے کاغذ آتش زدہ میں نے
تاروں کے سلیقے سبھی جاگیر لکھی ہے
احمد علی کیف/بہاولنگر

اے موجۂ پیراک کی دیوار ترے ہیں
اس ہجر کے پاتال میں رخسار ترے ہیں
شب موجِ سخن خیز کی تنہائیاں لے کر
تاریک سی اک لہر میں گلزار ترے ہیں
پانی کی تہہ سبز میں انگور کی تمثال
شاخوں سے لپٹتے ہوئے کچنار ترے ہیں
گاؤں کی ہوا میں ترا اس پاؤں کا دھرنا
نم گھاس کی ڈالوں پہ سخن زار ترے ہیں
کمرے کی میں دہلیز پہ رکھ آؤں گا صدیاں
کچھ ماہِ رواں عرش پہ بیکار ترے ہیں

شہزادیوں جیسی ہے جبیں، نور کی شبنم
ہاتھوں کے نم خاص یہ ہم یار ترے ہیں
اُجلے سے پہاڑوں پہ بچھی کیف کی صورت
وہ شبنمی آواز کہ لب تار ترے ہیں
احمد علی کیف/بہاولنگر

دُعاؤں کا ثمر ملتا تو اچھا تھا
محبت کا شجر ملتا تو اچھا تھا
ملے ہیں آنکھ والے ہر جگہ مجھ کو
کوئی صاحب نظر ملتا تو اچھا تھا
گزر جاتے ہمارے دن بھی جنت میں
تری گلیوں میں گھر ملتا تو اچھا تھا
کنارے پر نہیں تھا مہرباں کوئی
تو دریا میں بھنور ملتا تو اچھا تھا
کئی در وا ہوئے تھے میری آمد پر
کسی مرشد کا در ملتا تو اچھا تھا
جہاں بھی جاتا میں افضل زمانے میں
وہی چہرہ اگر ملتا تو اچھا تھا
افضل عباسی/صادق آباد

تنہا فلک پہ کوئی ستارہ نہیں رہا
یعنی کہ کوئی دوست ہمارا نہیں رہا
جانے کہاں پہ ہم کو لیے جاتی ہے حیات
خود اپنی ذات پر بھی اجارہ نہیں رہا
ہر شخص ہو گیا ہے منافق یہاں پہ اب
اس شہر میں تو اپنا گزارا نہیں رہا
اک پیڑ تھا سو گر گیا آندھی میں رات وہ
آنگن میں کوئی اپنا سہارا نہیں رہا
وہ شخص مل گیا تو منافع ہے اس قدر
اب زندگی میں کوئی خسارہ نہیں رہا

افضل بھلا دیا ہے جسے بس بھلا دیا
جو شہر چھوڑ آیا دوبارہ نہیں رہا

افضل عباسی/صادق آباد

یہ شہر ہے اُداس مرا دل جو ہے اُداس
پہنا سیہ لباس مرا دل جو ہے اُداس
بیٹھا رہا ہوں یونہی میں کالج کے لان میں
توڑی ہے یونہی گھاس مرا دل جو ہے اُداس
میں جو بھی کام کرتا ہوں ہوتا نہیں ہے ٹھیک
آتا نہیں ہے راس مرا جو ہے اُداس
کوئی نہیں ہے ساتھ مرے ساتھ ساتھ
میں خود ہوں اپنے پاس مرا دل جو ہے اُداس
کل کی طرح سے آج بھی خاور نعیم بٹ
پھر چھوڑ دی کلاس مرا دل جو ہے اُداس

خاور نعیم بٹ/لاہور

میری انتہائے حسرت کو وہ آزما رہے ہیں
میں نظر ملا رہا ہوں وہ نظر چرا رہے ہیں
رہے چارہ گر سے کیسی یہ اُمید چارہ سازی
کہ یہ دل میں بسنے والے مرا دل جلا رہے ہیں
جو ہے دور میری منزل بڑا حوصلہ ہوا ہے
کئی لوگ بن کے ساتھی میرے ساتھ جا رہے ہیں
شب غم کی آپ بیتی غم شب وہ اک فسانہ
میں انہیں سنا رہا ہوں وہ مجھے سنا رہے ہیں
میرے دل کی بیقراری تو بڑھتی ہی جا رہی ہے
میرے مہربان مجھ کو جو گلے لگا رہے ہیں
یہ ہے کیسا کھیل دیکھو دیکھو سحر اُن کی انجمن میں
کوئی زندہ جل رہا ہے کئی مسکرا رہے ہیں

سحر سرفراز بودلہ/اوکاڑہ

اپنی بیٹی مریم بتول حیدر کے نام

ماضی کے دُھندلے چہروں میں
اک روشن چہرہ مریم کا
میرے خوابوں میں ہنستا بستا
یادوں کے جگنو اِدھر اُدھر
میرے آنگن منڈلاتے ہیں
میرا دل بہلانے آتے ہیں
سوچوں میں گم صم گم صم ہوں
میں اور حقیقت ملتے ہیں
تنہا جیون کی گلیوں کو
مریم کے پیار سے بھرتے ہیں
پر لگتے گئے ہیں سالوں کو
جیون پھر اپنی چال چلا
یوں مجھ کو میرا حال ملا
شادی کے بندھن میں بندھ کر
سب خواب سہانے ہو گئے ہیں
پھر مالک کھیل رچاتا ہے
آنگن میں پھول کھلاتا ہے
ہر آن بنی مریم گہنا
پھر آتا گیا دکھڑا سہنا
پھر دل سے دل بھی ملتے گئے
مریم ہولے ہولے بولے
بابل اپنے دُکھڑے بھولے
جیون کے صفحے پہ مریم
میرا تو شہکار بنی ہے
اس جیون کا پیار بنی ہے
میرے دل کا اتنا کہنا
بابل سے تم دور نہ رہنا
میرے جیون کی سب خوشیاں
تیرے کھلنے سے قائم ہیں
مریم کی مسکان کے صدقے
بابل کی جند جان کے صدقے
میرے مولا میرے مالک
ہر گھر میں تم پھول کھلانا
اور مریم کی سندرتا سے
میرے جیون کو مہکانا

حیدر علی ساحر/اوکاڑہ

دو چار باتیں کیا کہیں گھبرا گیا کوئی
مجھ کو بنا کے جگ میں تماشا گیا کوئی
میں نے کہا کہ بیٹھو گے میرے قریب تر
آنکھیں جھکا کے شرم سے شرما گیا کوئی
شب بھر تو نیند آئی نہ اس کے خیال میں
کھٹکا لگا رہا ہے کہ کہیں آ گیا کوئی
اُس کی تو خوبصورتی پہ کوئی شک نہیں
آئنہ مجھ کو حسن کا دکھلا گیا کوئی
اک شمع جل رہی تھی نگاہوں کے سامنے
ایسے میں چاند بن کے نظر آ گیا کوئی
اُلفت کو نیند آئی نہیں آج رات بھر
آؤں گا ملنے خواب میں فرما گیا کوئی

ڈاکٹر سعید اُلفت/لاہور

کسی دُکھ میں اُتر گئی ہوں میں
کچھ دنوں سے بکھر گئی ہوں میں
پہلے تو اپنے پاس ہوتی تھی
کیا خبر اب کدھر گئی ہوں میں
دیکھ کے حال روندے پھولوں کا
اپنے خوابوں سے ڈر گئی ہوں میں
مجھ کو ملتی رہیں اُداس آنکھیں
اس جہاں میں جدھر گئی ہوں میں
اُس نے دیکھا ہے اتنی چاہت سے
بیٹھے بیٹھے سنور گئی ہوں میں
جب وہ رُوٹھے تو نایا لگتا ہے
جیسے اندر سے مر گئی ہوں میں

نایا سحر/گجرات

افسانہ

جدائی کا درد

بی بی حلیمہ بشریٰ

ایک خوف زدہ سی لڑکی آئی اور سہمے ہوئے انداز میں آکر میرے قریب بیٹھ گئی۔۔۔جس کے بُرقعے پر کئی کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔۔۔کچھ منٹ تک سہمے ہوئے انداز میں ایک پُرانا بوسیدہ کپڑے کا تھیلہ گود میں تھامے مجھے وقفے وقفے سے دیکھتی رہی۔۔۔

تھیلہ سیٹ پر رکھ دو۔۔۔سفر بہت زیادہ ہے۔۔میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔۔۔

تمہارے ماں باپ ہیں؟؟ اُس نے تھیلہ نیچے رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔۔۔

اچانک اُس کے مُنہ سے ایسا سوال سن کر میں حیران رہ گئی اور اثبات میں سر ہلایا۔۔۔

وہ پیار کرتے ہیں تمہیں؟؟ اس نے ایک اور حیران کن سوال کیا۔۔

ہاں۔۔۔تمہارے ماں باپ۔۔۔۔۔۔نہیں ہے کیا؟؟ میں نے کہا۔۔

میرے ماں باپ۔۔۔تھے۔۔۔بچپن میں مجھے ریلوے سٹیشن پر تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔۔اُس نے دُکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔۔

اوہو۔۔۔میں نے اُس کا درد محسوس کرتے ہوئے کہا۔۔

وہ میری جانب مُڑی اور اپنی داستان سُنانے لگی جیسے وہ ایک عرصے سے اسی انتظار میں تھی کہ کب کوئی آئے اور اُس کی کہانی سُنے۔۔

میرے ماں باپ ایک دن مجھے گھمانے کے لئے ریل گاڑی میں راولپنڈی لے کر آئے مگر اچانک مجھے سٹیشن پر تنہا چھوڑ کر چل پڑے۔۔۔مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اماں ابّا جا رہے تھے۔۔میں روتے روتے سِسکیاں بھرتے اُن کے پیچھے ڈگمگاتے قدموں سے جا رہی تھی۔۔۔ایک بار اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا بھی۔۔۔مگر پھر ہوا کی تیزی سے آگے بڑھے اور ریل گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔۔۔ریل کی سیٹی بجی اور مجھے میرے ماں باپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا کر گئی۔۔میں چھوٹی سی تھی اور امی ابّو کی تلاش میں اِدھر اُدھر بے چین آتما کی طرح بھٹک رہی تھی۔۔۔اور آخر کار تھک ہار کر روتے روتے ایک کونے میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔۔بھوک پیاس کے مارے ہلکان ہو رہی تھی۔۔

اتنے میں دو آدمی آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا اور جیب سے چاکلیٹ نکال کر مجھے دیتے ہُوئے پوچھا۔۔۔بیٹا کون ہو تم اور کیوں رو رہی ہو؟؟

مم۔۔مم۔۔مم۔۔میں سس سس سس سکینہ۔۔۔امی ابّو چھوڑ کر چلے گئے اب میں گھر کیسے جاؤں گی۔۔۔میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

چلو آؤ ہم تمہیں گھر چھوڑ آئیں گے۔۔انہوں نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔۔

وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے گئے مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں سُلا دیا۔۔دو تین دن تک تو میں وہاں آرام سے رہ رہی تھی کہ چوتھے دن ایک اور آدمی جو نہایت فربہ، گہرا کالا رنگ، چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، گول بڑے سے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں، گھنے آبرو اور ہاتھ میں ایک باریک سی چھڑی تھی۔۔کمرے میں داخل ہوا۔۔اس نے ایک پاؤں اُٹھا کر میری چار پائی پر رکھا اور سر ترچھا کر کے مجھے گھورنے لگا۔۔اور پھر چھڑی میری ٹھوڑی پر رکھ کر میرا چہرا دوسری جانب موڑ کر اُسی وحشت ناک انداز سے گھورنے لگا۔۔

اچھی ہے۔۔۔معصوم سی صورت ہے۔۔کام اچھا چلے گا۔۔شاباش۔۔باس خوش ہوا۔۔اُس آدمی نے جو خود کو اُن کا باس کہہ رہا تھا، نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔۔اور ہوا کی تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔۔

دونوں نوجوانوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی پھر ایک نوجوان نے دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا تو دوسرا نوجوان میری جانب لپکا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگا۔۔وہ مجھے کسی تاریک کوٹھری میں لے گیا۔۔زینے اُترتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نیچے اُتر رہے ہیں مگر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔کہ اچانک کسی دروازے کے کُھلنے کی آواز آئی۔۔۔دروازہ بہت پرانا اور بوسیدہ تھا جس کے کھلتے ہی ایسی آواز آئی جیسے شکاری کا تیر لگتے ہی ہرن کے حلق سے نکلتی ہے۔۔

دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ اندر بہت سے چھوٹے اور معصوم معصوم بچے تھے جو سہمے ہوئے انداز میں ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھے تھے۔۔۔

چلو اُٹھو کام کا وقت ہو گیا ہے۔۔نوجوان نے دھاڑ کر کہا۔۔

بچے ڈر گئے اور اُٹھ کر جلدی سے قطار در قطار باہر آنے لگے۔۔

اور پھر ہم سب اُنہی تاریک زینوں پر چڑھنے لگے اور اوپر آ گئے۔۔اب ہم تاریکی سے روشنی میں آ گئے تھے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی مجھے ہمیشہ کے لئے تاریکیوں میں جھونک رہی ہے۔۔جب میں نے روشنی میں باقی بچوں کو دیکھا تو ان کے چہروں

اور جسم پر جگہ جگہ نیل کے نشان تھے۔۔

پھر مجھے ان بچوں کی بھیڑ میں ملا کر ایک گاڑی میں بٹھایا گیا اور ہم سب کو ریلوے سٹیشن لے جایا گیا۔۔ دور سے ریل کی آواز آ رہی تھی۔۔ آواز قریب آتی گئی۔۔ ریل کی سیٹی بجی۔۔ گاڑی رکی اور مسافر اترنے لگے۔۔ میں مسافروں کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس نوجوان نے مجھے دھکا دے کر کہا کہ جاؤ باقی بچوں کے ساتھ کام پہ لگ جاؤ۔۔

سب بچے سٹیشن پر پھیل گئے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر اور مسافروں کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر بھیک مانگ رہے تھے۔۔ میں چُپ چاپ کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی کہ ایک بچی میرے پاس آئی اور ہکلا کر بولی۔۔ پپ پپ پپ پے پیسے مانگو۔۔۔ وو وو ورنہ یہ ۔۔ لوگ ب ب ب بہت مارتے ہیں۔۔۔ اس چھوٹے سے جملے کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس بچی کی سانس پھول گئی اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔۔۔

یہ سلسلہ چلتا گیا۔۔ وقت بیتتا گیا۔۔ ہمیں روز ریلوے سٹیشن پر چھوڑ دیا جاتا اور شام کو ہم سے پیسے بٹور کر اُسی تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا۔۔

روز سٹیشن پر میری نظریں مسافروں پر ٹکی رہتیں اس امید پر کہ شاید میرے ماں باپ لوٹ آئے۔۔۔ کبھی کبھی کسی مسافر میں اپنی ماں کی جھلک نظر آتی اور دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔۔۔ مگر اس کے دُھتکارنے پر اِحساس ہوتا کہ وہ میری ماں نہیں ہے۔۔

آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب دبائے میں وہاں سے دبے پاؤں واپس چلی جاتی۔۔۔

آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے سکینہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بھیگی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جُھکا کر اپنا قصہ جاری رکھا۔۔

یوں وقت بیت رہا تھا اور ہم ۲۰ سال تک اس ریلوے سٹیشن سے وابستہ رہے۔۔ روزانہ کافی تعداد میں لوگ ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے عزیزوں سے ملتے جبکہ بہت سے لوگ آنکھوں میں آنسوؤں کا شانت سمندر بسائے اپنوں سے بچھڑتے۔۔۔ ملنے اور بچھڑنے کا یہ سلسلہ روز ہی ہمیں سٹیشن پر دیکھنے کو ملتا۔۔ بچپن سے جوانی تک ۲۰ سال سے روزانہ ہم یہی نظارے کرتے۔۔۔

ریل کے چوتھے ڈبے کے دائیں سیٹ پر میں پہلی بار اپنے ماں باپ کے ساتھ اس سٹیشن پر آئی تھی۔۔ اور تب سے میں روز اسی سیٹ کے مسافر کے پاس آ کر دُعا دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے پیاروں سے کبھی جُدا نہ کرے۔۔ جدائی بہت دردناک ہوتی ہے اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے تو مجھے انجانی سی خوشی ملتی۔۔۔ اس کے بدلے اس مسافر سے مجھے اچھی خاصی رقم مل جایا کرتی۔۔ مگر میں یہ دعا اپنی خوشی اور اپنے سکون کے لئے کرتی تھی۔۔

پچھلے ایک ہفتے سے مجھے مسلسل اس سیٹ پر ایک ہی شخص سفر کرتا دکھائی دیا۔۔ میں روز جا کر دعا دیتی۔۔ آخر کار اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟؟ اور روز اسی سیٹ پر آ کر دعا کیوں دیتی ہو؟؟ اس کی آنکھوں میں اور بھی بہت سے سوال تھے۔۔

میں کون ہوں یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔۔ اور پھر اپنا آدھا ادھورا قصہ اس مسافر کے گوش گزار کیا۔۔

اس مسافر کی آنکھیں چھلک اُٹھی۔۔ اور مجھ پر ہمدردانہ نظریں ڈالی۔۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔ کیا تم عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو؟؟ شادی کروگی مجھ سے؟؟ اس شخص نے پوچھا۔۔

۲۰ برس کے بعد ایسا ہمدردانہ جُملہ سماعتوں سے ٹکرایا۔۔ میں چپ چاپ کھڑی اس اجنبی کو تکتی رہی۔۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔۔

شادی کروگی مجھ سے؟؟ لڑکے نے ایک بار پھر اپنا سوال دُھرایا۔۔

ہاں۔۔ میں نے اس لڑکے کو تکتے ہوئے جواب دیا۔۔ شاید مزید کچھ کہنے کی مجھ میں سکت نہ تھی۔

وہ لڑکا اُٹھا اور ڈبے کے دروازے پر آیا اور ہاتھ بڑھا کر مجھ سے کہا کہ اندر آ جاؤ۔۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے سنگ چل دی۔

میری حیرت کی انتہا تو تب ہوئی جب وہ واقعی مجھے اپنے گھر لے گیا اور گھر والوں سے بات کر کے اگلے ہی دن مجھ سے نکاح کر لیا۔۔ میں بہت خوش تھی مگر ایک بات اب بھی مجھے پریشان کرتی ہے کہ آخر میرے ماں باپ مجھے سٹیشن پر تنہا چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔۔ ایسی کون سی مجبوری تھی۔۔ اگر چھوڑ کر ہی جانا تھا تو جنم کیوں دیا۔۔

سکینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر ساتھ ہی ساتھ اطمینان بھی تھا کیونکہ اب وہ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔۔

میں بچوں کے لئے کپڑے لینے آئی تھی اور اب اپنے شوہر کے ساتھ واپس گھر جا رہی ہوں۔۔۔ سکینہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔۔

میں اس کے قصّے میں اتنی غرق ہو گئی تھی کہ اب تک اسے گھور رہی تھی۔۔

میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔۔ اس نے میرا ہاتھ ہلا کر کہا۔۔

بہت ہمت والی ہو تم۔۔ میں نے اس کا ہاتھ ذرا سا دبا کر کہا۔۔

بس رُک گئی۔۔۔

ہمارا سٹیشن آ گیا۔۔ اب ہمارے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہے۔۔ خُدا حافظ۔۔ میں نے سکینہ سے رُخصت لیتے ہوئے کہا۔۔

افسانہ

بھوک

دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

میں یونہی کھڑکی پر آن کھڑی ہوئی تو میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے ایک بائیس تیئیس سالہ خوبرو نوجوان پہ جا ٹکی۔ اُسے دیکھتے ہی اچانک میرے دل میں ہزاروں آرزوئیں کروٹیں لینے لگیں۔ لاکھوں خواہشیں مچلنے لگیں۔ خواہشیں اور ایسی خواہشیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ پھر آہستہ آہستہ میرے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی سنسناہٹ پھیلنے لگی اور اندرون میں لاکھوں چیونٹیاں ایک ساتھ رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سینہ جستہ جستہ پھولنے لگا۔ جس کے سبب کسا ہوا بلاؤز مزید کسنے لگا تھا۔ اس کے برعکس پیٹی کوٹ کی ڈور ڈھیلی ہوتی گئی۔ ساڑھی تو آج میں نے باندھی ہی نہ تھی۔ الغرض صبح ہی سے میں اسی کیفیت سے دو چار تھی۔

گزشتہ دو مہینوں سے رہ رہ کے مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ جب بھی مجھ پر اس کیفیت کا نزول ہوتا میرے برتاؤ میں ایک طرح کا وحشی پن در آتا۔ میں ایک ایسے حیوانی جذبے کے زیر اثر آ جاتی جو دنیا کا سب سے زیادہ شدید اور طاقت ور جذبہ ہوتا ہے۔ جس کے مداوا کی خاطر میں گاؤ تکیہ لے کر پہلو میں سمیٹ لیتی اور دیر تک خود کو بستر پر اُلٹتی پلٹتی رہتی یا اُسے رانوں کے درمیان اڑس کے زور زور سے دباتی۔ اس عمل سے جب اُکتا جاتی تب بستر پر اُٹھ کھڑی ہوتی اور اپنے پیروں سے تکیہ کو یوں بے تحاشہ ٹھوکریں مارنے لگتی گویا وہ تکیہ نہیں کوئی فٹ بال ہو۔ ایسا کرتے ہوئے میری سانسیں بے ہنگم ہو جاتیں اور میں تھک کے بستر پر ڈھیر ہو جاتی۔ جب سانسیں قدرے قابو میں آ جاتیں تب میں سیل فون اُٹھا کر اپنے شوہر صدام جو برائے روزگار سعودی عرب میں مقیم ہے اس سے رابطہ قائم کرتی۔ صدام سیل فون کی اسکرین پر میرا نام فلیش ہوتے دیکھ کر حسب معمول ریسونگ سوئچ آن کرتے ہی والہانہ انداز میں سلام عرض کرتا۔ میں جواب میں مختصراً دریافت کرتی۔ کب آ رہے ہو ظالم؟ صدام کی جانب سے جو جواب ملتا اُس سے میں بے طرح جھنجھلا جاتی اور فوراً رابطہ منقطع کر کے ایک بھدی سی گالی دیتی ہوئی سیل فون بستر پر اُچھال دیتی۔

میرا بیاہ صدام سے ہوئے غالباً چار سال بیت چکے تھے۔ بیاہ کے وقت وہ شہر کے ایک اوور برج کے تعمیراتی کام میں کسی ٹھیکیدار کے ساتھ ویلڈر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن ورلڈ بنک کے ذریعے رقم کی فراہمی روک دیے جانے سے یہ کام التواء میں چلا گیا اور تمام کے تمام مزدور بے روزگار ہو گئے۔ صدام تین چار مہینے اب تب میں بیروزگاری جھیلتا رہا۔ مگر جوں ہی اُسے احساس ہوا کہ مذکورہ پروجیکٹ اب سیاست کی نذر ہو چکا ہے اس نے فوراً سعودی عرب کی ایک کنسٹرکشن کمپنی کی ویکنسی دیکھ کر الریاض میں واقع الامان ٹریولز کے آفس میں اپنا پاسپورٹ جمع کروا دیا اور پندرہ دنوں کی قلیل مدت میں دو سال کے معاہدے پر سعودی عرب پہنچ گیا۔ اب اُسے سعودی عرب گئے ہوئے سولہ مہینے گزر چکے ہیں اور معاہدے کے مطابق واپس آنے میں محض آٹھ مہینے رہ گئے ہیں۔ مگر میرے لیے اب شوہر کے بغیر آٹھ دن بھی گزارنا محال ہے۔ اسی سبب آج میں مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ چاہے جو ہو میں اب اس آزار سے نجات حاصل کر کے ہی رہوں گی۔

وہ نوجوان مکمل طور پر میری نگاہوں کے حصار میں تھا۔ نیلے رنگ کی جین پینٹ اور فیروزی رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس، ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری تھیلا، بال اُلجھے بکھرے، چہرے پر تھکن اور پریشانی کے آثار۔ باوجود اس کے اُس کی مردانہ وجاہت قابل رشک تھی میں نے اُسے مدہوش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر سرد آہ بھرتے ہوئے بڑبڑائی۔

ہائے...... میری زندگی کے اُفق پر آج تک ایسا وجیہہ مردانہ مکھڑا نہیں جگمگایا تھا۔ جسے دیکھ کے پور پور سنسنا اُٹھے۔

اسی گھڑی نوجوان نے وہاں سے گزرتے ایک راہ گیر سے کچھ دریافت کرنا چاہا تھا مگر وہ پل بھر رُکے بغیر لاعلمی کا اظہار کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اُس کے اس رویے سے نوجوان کے چہرے پر تشویش کا سایہ قدرے گہرا ہوگیا۔ وہ چند لمحے یوں ہی ساکت کھڑا بے بسی سے اِدھر اُدھر تکتا رہا۔ پھر انتہائی بوجھل قدموں سے آگے بڑھا۔ اُسے جاتے دیکھ کر میں نے پکارا۔ ''سنو!''

وہ ٹھٹک کر رُک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ جوں ہی ہم دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں میں نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ نوجوان پہلے تو جھجکا پھر آہستہ آہستہ اپنا رُخ میری کھڑکی کی جانب کرلیا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا اُس کا چہرہ بے طرح مرجھایا ہوا، نیز ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ اس سے قبل کہ نوجوان لب کشائی کرتا میں نے دریافت کیا۔

''شاید تم کسی کی تلاش میں ہو؟''

''ج...... ج...... جی...... آپ یاسر علی کو جانتی ہیں؟'' وہ لڑکھڑائی آواز میں بولا۔

کون یاسر علی...... جو یو۔ بی۔ ایل بنک میں سپروائزر ہیں؟ اُس کے چوڑے سینہ اور بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں کو نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہیں...... ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔ یہیں کہیں رہتے ہیں؟''

پتا کیا ہے اُن کا؟

قصبہ پھول پور کے ہیں۔

اُف میرے خدا، میں قصبہ کا نہیں۔ یہاں کا پتہ پوچھ رہی ہوں۔ میں زچ ہو کر بولی۔

نوجوان کے چہرے پر زہرخند مسکراہٹ پھیل گئی۔ بھابی جی۔ میرے پاس پتہ ہوتا تو چار دنوں سے یوں مارا مارا کیوں پھرتا؟

ارے بابا! یہ لاہور شہر ہے لاہور...... دل والوں کا شہر...... تمہارا گاؤں دیہات نہیں۔ یہاں کسی سے بھی پوچھ پچھار کر آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ یہاں تو پڑوسی پڑوسی ہی کو نہیں جانتے پہچانتے۔ میں نے دلبرانہ انداز سے کہا۔

ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں بھابھی جی لیکن کیا کروں۔ میرے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوئی ہے۔

ٹریجڈی......! کیسی ٹریجڈی؟ اُس کی پیشانی پر استعجاب کی سلوٹیں پڑ گئیں۔

میں اسٹیشن سے گلبرگ آنے والی بس میں سوار ہونے کے لیے جوں ہی بڑھا اچانک دھکم پیل مچ گئی اور اسی دوران کسی نے میرا پرس اُچک لیا۔ پرس ہی میں کئی عزیزوں کے پتے اور فون نمبر تھے۔ کہتے ہوئے اُس کی آواز رندھ گئی۔

تو کیا تم گاؤں سے آئے ہو!

جی!

لاہور کا پہلا سفر ہے؟

اب زبان سے کہنے کی بجائے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

یہ یاسر علی کون ہیں تمہارے؟

بڑے بھیا!

یہاں گلبرگ میں کب سے رہتے ہیں؟

یہی کوئی چار سال سے۔

پھر تو ڈونٹ وری...... فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کہتے ہوئے ایک بار پھر اُس کے سراپا کو سوچتی نگاہوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

تم کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ ایک کام کرو اندر آجاؤ کچھ دیر آرام کرلو۔ تمہارے بھیا کا پتہ ہم پھر لگالیں گے۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرے ذہن کا دوسرا ٹریک سوچ رہا تھا کہ اچھا ہے کہ بے سہارا ہے۔ اسے سہارا دے کر آسانی سے رام کیا جاسکتا ہے۔

میری اس پیشکش سے نوجوان کا چہرہ کھل گیا اور وہ شاید دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ بے شک دیارِ غیر میں بھی اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کو حامی و مددگار بنا کر کھڑا کر ہی دیتا ہے۔ یہی اُس کی شان کریمی ہے۔

نوجوان جوں ہی فلیٹ میں داخل ہوا میں نے جلدی سے دروازہ بولٹ کردیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے سیدھے بیڈروم میں لے آئی اور کیف و مستی سے سرشار لہجے میں کہا۔

یہاں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور جیسے چاہو آرام کرو۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور میری جانب ملتمس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بھابھی جی...... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

میں اُسی مستی کی کیفیت میں ریت کی دیوار کی مانند اُس پر ڈھیر ہوگئی اور شوخ لہجہ میں کہا۔

ارے بے دال کے بودم...... بھابی اور دیور کے درمیان کم بخت یہ احسان کہاں سے گھس آیا اور اُس کے چوڑے سینے سے اپنا محراب دار اور گداز سینہ مس کردیا۔ ایسے کرتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ جلد ہی اُس کے جذبات برانگیختہ ہوجائیں گے اور وہ میری گل بدنی کو اپنی بانہوں کے حصار

میں لے کر میرے شباب میں اپنی مردمی پیوست کرنے کے لیے بے قرار ہو جائے گا لیکن کافی دیر بعد بھی میرے اس عمل سے نوجوان کے اندر نہ ہوس کے بھیڑیے غرائے نہ ہی آنکھوں میں چاہت کی مہتابیاں چھوٹیں۔ وہ بس یوں ہی بے جان لاش کی طرح پڑا خلا میں تکتا رہا۔ میں جھنجھلا گئی۔ کہیں اُس کی مردانگی ناکارہ تو نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کچھ مردوں کو مشتعل کرنے کے لیے رجھانا پڑتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اُچھل کے فرش پر آن کھڑی ہوئی اور دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ ایسا کرتے ہوئے میرا سینہ اس قدر تنا کہ بلاؤز پر ٹنکے تین بٹنوں میں درمیانی بٹن بلاؤز سے جدا ہو کر فرش پر آ رہا۔ اس پر بھی نوجوان کی آنکھوں میں نہ شہوت کا چمن زار آباد ہوا نہ ہی چہرے پر ہیجان کی کلیاں چٹکیں۔ میں چونک پڑی۔

ارے یہ کیا! تشنہ دہن تو صحرا میں نخلستان دیکھ کے خوش ہوتے ہیں اور یہ ہے کہ......

پھر سوچا شاید وہ بے توجہی کا شکار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی خاطر بلاؤز سے جدا ہوئے بٹن کو فرش سے اُٹھا کر اُسے دکھاتے ہوئے قدرے اُٹھلا کر کہا۔

''لو...... بیٹھے بٹھائے ایک کام بڑھ گیا۔ اب اسے ٹانکنا ہوگا۔ پھر اسے للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بلاؤز کے باقی ماندہ دونوں بٹنوں کو بھی ایک ایک کر کے کھول دیے اور بلاؤز کو بدن سے الگ کر دیا۔ اسی لہر میں کولہوں پر اٹکی پٹی کوٹ بھی اُتار پھینکی اور کسی فیشن شو کے ماڈل کی مانند بیڈ روم میں کیٹ واک کرنے لگی۔ قدرے توقف کے بعد ترنگ میں آ کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کے انگڑائی لی۔ نیز گردن کو پشت کی جانب جھکاتے ہوئے بدن کو کمان بنا لیا۔ میرے اس عمل سے سینے پر آباد کبوتروں کا جوڑا گھونسلے سے باہر آنے کو پھڑ پھڑانے لگا۔ اس پر بھی نوجوان کی آنکھوں کا سمندر پرسکوت رہا۔ دور دور تک شہوت کی کوئی بھی لہر نہ تھی۔ چار و ناچار میں تیر کی طرح سیدھی ہو گئی اور قدرے مایوسی سے خلاء میں گھورتے ہوئے سوچنے لگی۔

''جوانی جب بے نیاز پیراہن ہوتی ہے تو مردانگی بدن کا تناسب، شادابی دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے لیکن...... لیکن یہ کیسا مرد ہے! لاہوری صفت بدن کا نظارہ پانے کے بعد بھی اُس کی مردانگی فصیل آباد میں زلزلہ نہیں آ رہا ہے۔ کہیں اُس کی مردانگی قحط زدہ علاقہ تو نہیں؟ میں اسی سوچ میں مستغرق تھی کہ نوجوان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

بھابھی جی......

آں! میں چونک پڑی اور میری سوچ کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

پلیز ایک گلاس پانی پلا دیں۔

ہاں ہاں! کیوں نہیں...... کہتے ہوئے میں کچن کی جانب لپکی۔ ساتھ ہی زیر لب بڑبڑاتی رہی۔ ارے ظالم! پانی کیا میں تو تجھے اپنی جوانی پلانے کی جستجو میں سراپا صراحی بن چکی ہوں لیکن تیرے لب ہیں کہ میری جانب بڑھتے ہی نہیں۔

میں بجائے پانی کے شیشے کے شفاف گلاس میں شربت روح افزا لے آئی اور اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔

معذرت چاہتی ہوں میں مہمان نوازی کے فرض سے غافل رہی۔

اُس نے کسی تاثر کے بغیر میرے ہاتھ سے گلاس تھام کر گٹ گٹ سارا شربت حلق سے نیچے اُتار لیا اور مجھے پرممنون نگاہوں سے تکنے لگا۔

ایک گلاس اور لاؤں؟ میں نے اس کے دیکھنے کے انداز پر استفسار کیا۔

کچھ کھانے کو...... بچا ہو تو...... بہت تیز بھوک لگی ہے۔ تین دنوں سے کچھ کھایا نہیں ہے نا......!

اف میرے خدا۔ میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ کہتی ہوئی کچن کی جانب دوڑی۔ چند لمحے توقف کے بعد ایک رکابی میں سالن اور دوسری میں تھوڑا سا سالن اور دو روٹیاں لیے حاضر ہوئی۔

لو...... تمہاری قسمت کا اتنا ہی بچا تھا۔

وہ دونوں رکابیاں میرے ہاتھ سے تقریباً جھپٹتے ہوئے بولا ''زندہ رہنے کے لیے اتنا بہت ہے۔ پھر وہ کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑا جیسے مہینوں بعد اُسے رزق میسر آیا ہو۔ اس کے کھانے کے اس ڈھنگ پر میں نے تاسف سے سوچا۔ کاش! ایسے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑتا اور میرے بدن کو خوب نوچتا کھسوٹتا۔ میری جوانی کا ریشہ ریشہ اُدھیڑ دیتا۔ بہرحال! دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دونوں رکابیاں صاف کر دیں۔ اس دوران میں پانی کی بوتل کے علاوہ ایک عدد سیب اور دو کیلے رکھ کے ٹوائلٹ کی جانب چلی گئی تھی۔

پانی پی کے نوجوان نے ایک ڈکار لیا اور

اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا۔ پھر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ میں جب لوٹی تو دیکھا سیب اور کیلے یوں ہی دھرے ہیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں موندے پڑا ہے۔ میں چند لمحات اُسے یوں ہی ہولناک نگاہوں سے تکتی رہی۔ پھر قدرے تیکھی آواز میں کہا ارے تم نے یہ پھل نہیں کھائے؟

میری آواز پر اُس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ پھر جیسے پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا۔ اُس کی اس ادا پر میرے چہرے پر تبسم رقص کرنے لگا اور میں لپک کر اُس کے پہلو میں جا پہنچی۔ پھر اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر استفسار کیا۔

مجھے دیکھ کر یوں مبہوت کیوں ہو گئے؟ ایسا جان پڑتا ہے جیسے مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔

''جی...... نہیں نہیں...... ہاں...... شاید'' اُس کے لہجے میں بوکھلاہٹ در آئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

شاید نہانے جا رہی ہیں آپ؟

نہیں تو! میں نے پر استعجاب لہجہ میں کہا۔

پھر...... آپ نے کپڑے......؟

تنہائی میں کپڑے بوجھ لگتے ہیں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اتنے بڑے فلیٹ میں تنہا رہتی ہوں۔

کیا! اس کا چہرہ استعجابی ہو گیا۔ پھر کروٹ ہو کے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں یوں گاڑ دیں جیسے آنکھوں کے راستے میرے وجود کے صحرا میں داخل ہونا چاہ رہا ہو۔ موقع کو غنیمت جان کر میں نے بھی اپنے لبوں کو اُس کے لبوں کی بارگاہ میں حاضر کر دیا اور دھیرے سے پھسپھسائی۔

تم نے پھل نہیں کھائے۔ تمہیں تو بڑی تیز بھوک لگی تھی؟

ہاں! اُس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

بھابی جی میں پورے تین دنوں سے بھوکا تھا۔

اُف میرے اللہ! تین دنوں سے متواتر؟ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ہاں! شریعت کے مطابق مجھ پر حرام اور مردار اشیاء بھی حلال ہو چکی تھیں۔ کہتے ہوئے میری پشت پر اُس کا ہاتھ حجابانہ انداز میں آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔

لیکن میں تو سولہ مہینوں سے بھوکی ہوں۔ مجھ پر کیا کیا چیزیں حلال ہوئی ہیں بتا سکتے ہو؟ میں نے جذبات کے لہجے میں سرگوشی کی۔ اُس پر میری اس بات کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا یا شاید اُس نے کیف و سرور میں سنا ہی نہیں تھا۔ بہر کیف!

وہ مجھ کو اپنی بانہوں کے حصار میں کستا ہوا بولا ''بھابھی جی...... ایک بات کہوں۔''

''ہو......'' اس کے لب پھسپھسائے۔

آپ بلا کی حسین ہیں۔

تم بھی تو غضب کے خوبرو ہو۔ کہتے ہوئے میں نے اُس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیے۔

جواباً اُس نے میرے ہونٹوں کے پیالے اپنے لبوں سے لگا لیے اور آن کی آن میں مدہوش ہو گیا۔ پھر اسی مدہوشی میں بولا۔

بھابھی جی آپ کے بدن سے نظر نہ آنے والے شعلے لپک رہے ہیں۔ ان ہی شعلوں میں تو جل رہی ہوں میں۔ کس میں تاب ہے جو مجھے ان شعلوں سے نجات دلا سکے۔ میں نے بے تابانہ کہا۔

اگر مجھ ناچیز کو اجازت دو تو......

میں اُلٹ کر اس کے اوپر سوار ہو گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرائی۔

تم اجازت کی کہہ رہے ہو۔ میں نے تو تمہیں برملا دعوت دی ہے۔

سچ! آرزوئے وصال کے گرداب میں مجھے بھینچتے ہوئے پوچھا۔ اگر میرا کہا سچ نہیں ہے تو تم میرے بیڈ روم میں کیوں ہو اور میں لباس سے بے نیاز کیوں ہوں؟

اُس کا اتنا کہنا تھا کہ بدن اور جسم ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ یوں بیتابیاں بڑھتی گئیں باہم تعارف کا سلسلہ بھی دراز ہوتا گیا۔ کبھی جسم بدن کے تاج محل کی سیاحت کرتا تو بدن جسم کے قطب مینار کے دید کا لطف حاصل کرتا۔ کبھی جسم بدن کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا تو بدن جسم کی سرحدوں پر بے خوف دوڑنے لگتا۔ انجام کار دونوں دوڑتے دوڑتے اپنی منزل کو پہنچ گئے اور منزل پا جانے کی سرشاری نے انھیں مدہوش کر دیا تھا۔ تقریباً گھنٹہ بھر بعد میری مدہوشی زائل ہوئی۔ میں نے فوراً خود کو نوجوان کے پہلو سے الگ کر لیا اور خود کو پشیمانی کے گرداب میں محسوس کرنے لگی۔ کیونکہ اب مجھ پر یہ انکشاف ہو چلا تھا کہ جسم کی بھوک سے کہیں زیادہ مقدم پیٹ کی بھوک ہوتی ہے اور اسی بھوک کے سلسلے میرا شوہر بھی میرے حسن و شباب، میری خوش بدنی کی لذت چھوڑ کر دیارِ غیر میں روٹیاں بنور نے گیا ہے۔

افسانہ

نامۂ سیاہ میں تھی

نسیم سکینہ صدف/ڈسکہ

نوشین! اتم شہر کے جنگل میں مجھ سے الگ ہو کر اتنی تنہا نہ پھرا کرو۔ برے وقت کا کوئی پتہ نہیں۔ کیا خبر کسی جھاڑی، کسی گاڑی کی اوٹ سے چار پہیوں سے چلتا کوئی بلاوا، چھلاوا آئے اور تمہیں دن دیہاڑے پکی سڑک پر گرا کر کچا کھا جائے۔

میری بے بسی قابل رحم ہے جو کچھ محسوس کرتی ہوں اور کہنا چاہتی ہوں الفاظ کی شکل میں آ کر اس کی حقیقت اور خوبصورتی نا تمام رہ جاتی ہے۔ اس وقت میرے قریب کوئی نہیں صرف میری ذات ہوتی ہے۔ جس میں اتنی قدرت نہیں رہتی کہ حلق میں پانی ٹپکا سکے۔

چارپائی پہ دھرے پاؤں میں پڑی زنجیر چھت کے شہتیر سے بندھی تھی اور نوشین کا مسکراتا چہرہ بس وعدے پہ وعدہ کیے جا رہا تھا۔

دیکھو...... میری جان...... جو ہوا اُس پہ خاک ڈالو۔ چھوٹے بڑے بچوں کا ساتھ ہے۔ میری محبت ہے جو بھی تم کر چکی ہو چھوڑ دو۔ بس ایسا کرو اب گھر کی طرف توجہ دو۔ بچوں کو سنبھالا۔ ننھا عنصر جو تمہارا دودھ پیتا تھا تمہارے جانے سے اُس نے بوتل میں دودھ پینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ضدی ہو گیا تھا۔ روتا ہی رہتا تھا۔ عروہ جو بڑی بیٹی تھی اُس نے جانے کیسے کیسے جتن کر کے اُسے منایا اور وہ دو گھونٹ دودھ پی کر پھر سے ایسے چیخ چیخ کر رونے لگتا جیسے اُسے ماں کی یاد شدت سے آ رہی ہو۔ نوشین! تم ماں ہو ان بچوں کی۔ تمہارے سائے کی انہیں بہت سخت ضرورت ہے۔ میں سب معاف کر دوں گا لوگ بھلے مجھے جتنی مرضی باتیں کریں کہ تمہاری بیوی ایسی ہے ویسی ہے۔ ایک کان سے سنوں گا اور دوسرے سے نکال دوں گا۔ ہم پھر سے نیا آشیانہ آباد کریں گے۔ بھول جائیں گے کہ کبھی ہمارے درمیان خنجر آیا تھا اور نوشین مسکرا مسکرا کر سر اثبات میں ہلاتی رہی اور طابش نے جان لیا کہ نوشین اب سیدھے راستے پہ آ گئی ہے۔ تیرہ سالہ بیٹی کا نکاح طابش نے اپنی بہن کے بیٹے سے کر دیا تھا اور اُسے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا تھا۔ وہ بھی انیس برس کا نوجوان تھا جو کہ سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا تھا کہ عروہ بہن بھائیوں کو بھی سنبھال لیتی اور اپنے شوہر کا بھی خیال رکھ لیتی۔ چھوٹی عمر میں ماں عذاب لمحے معصوم کے سر پر ڈال کر جو چلی گئی تھی تو نبھانا تو تھا ناں۔

دانش عروہ سے چھوٹا بیٹا۔ وہ ماں کی زنجیر اُتارنے کی کوشش کرتا مگر طابش اُسے آنکھ کی جنبش سے منع کر دیتا۔ اس کے اندر ابھی وسوسے پل رہے تھے۔ ذلت بھی تو نوشی نے اسے بہت دلائی تھی۔ اپنے سے دس سالہ چھوٹے پچھلی گلی میں رہنے والے زمانے کے ساتھ بھاگ کے جسے وہ چھوٹا بھائی چھوٹا بھائی کہتے اس کی زبان سوکھتی تھی اور ذلت کا ڈیڑھ ماہ گزار کر طابش نے برآمد کی تو شوہر کے پاؤں پڑ کر مگرمچھ کے آنسو بہا کر اُسے رام کر لائی۔

مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھ پر اُس کنجر نے جانے کون سے تعویذ کیے تھے کہ میری مت ماری گئی اور میں کیسے اپنا ہنستا بستا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

بس طابش سے غلطی یہی ہوئی تھی کہ کام کی معروفیت میں وہ بیوی کو بہت کم وقت دے پاتا۔ وہ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے اور جیولری میک اپ تو ویسے وہ اُس کے آگے ڈھیر رکھتا۔ مہندی سے پہلے ساتھ رہتے دلہنوں کی طرح اور وہ بڑی خوش خوش رہا کرتی۔ جانے کس زمانے کا ان کے گھر آنا جانا ہو گیا اور اس نے نوشین کی کمزوری جان کر اُسے کچھ آسودہ لمحے دینے شروع کر دیے اور نوشین اس کے لیے دیسی مرغی بنا کے رکھتی اور اپنے بدن کو خوشبو خوشبو بنا کر اس کا انتظار کیا کرتی اور وہ طابش کے گھر سے جاتے ہی وہ آ جاتا۔ محلے کی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں کام دھندوں میں مشغول ہوتیں اور اس وقت نوشین بلاجھجک اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کی مرتکب رہی ہوتی جس میں زمان بھی ملوث تھا۔

جب طابش کو اُڑتی سن گن ملی تو اس نے اس کا آنا جانا بند کروایا نوشین نے منہ سے اس کی مخالفت نہ کی لیکن اندر سے وہ کسی اور فیصلے کے آخری مراحل میں تھی۔ آخر ایک دوپہر کو سب محو خواب تھے اور وہ غائب۔ پچھلی گلی میں زمان اکیلا رہتا تھا۔ وہ مزدوری کے سلسلے میں ڈسکہ میں مقیم تھا۔ گھر والے ملتان کے کسی پسماندہ گاؤں کے رہائشی تھے۔ طابش غصے سے پاگل ہو گیا۔ اُسے جہاں جہاں ڈھونڈا گیا ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر اکیلے گھر میں جوان بیٹی کی حفاظت کرنا بھی بڑا کٹھن کام تھا جو بچپن کے بعد جوانی کی سرحد پہ کھڑی تھی۔ پھر جس کی ماں یہ اقدام کر چکی ہو اس کی بیٹی پر الزام لگتے دیر نہیں لگتی۔

نوشین کی تلاش کی تھکن نے لوگوں نے طابش کو تجویز دی تو وہ مجبور ہو گیا عمل کرنے پر۔ سو بھانجا پڑھ رہا تھا۔ تیرہ سالہ عروہ کا نکاح کر دیا۔ نہ مہندی لگی نہ ڈھولک کی تھاپ پڑی اور وہ کسی سرخ جوڑے میں لپٹی

کسی جنازے کے اُٹھنے کی طرح بڑے کمرے میں بہن بھائیوں کے ساتھ سونے کی بجائے اپنے کزن کے ساتھ جاسوئی۔ نہ جذبوں کا علم اور ازدواجی زندگی کے تقاضوں سے نابلد۔ غرض ماں کے جرم میں بیٹی ''بلی'' چڑھ گئی۔ خیر طابش نے کوشش ہنوز جاری رکھی۔ دن رات ایک کر کے تلاش میں اپنے روزگار کا ناس مار لیا۔ ذات کا جٹ تھا زمینوں کو وقت بے وقت پانی سے محروم رکھ کر فصل کچھ ہری اور کچھ سوکھ کے تباہ کر کے نوشین کو بالآخر ڈھونڈ ہی نکالا۔ اُس نے اپنے شوہر کے سامنے تو عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی اپنی جنت چھوڑ کے نہ جائے گی۔

کٹی پتنگ اور گھر سے بھاگی عورت کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سب ہی اس کو لوٹنے کے لیے بھاگ پڑتے ہیں۔

طابش نوشین سے بہت پیاری میٹھی میٹھی باتیں کر کے وہ اپنے من کی پیاس بجھا کر بڑے دنوں بعد سکون کی نیند سویا۔

بچے بڑے خوش تھے۔ چھوٹا تو اُس کی چھاتیوں سے لپٹ کے سو رہا تھا اور سوتے میں ایسے چسر چسر کر رہا تھا جیسے ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہو۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو سب سے پہلے طابش نے ایک میٹھی سی انگڑائی لیتے ہوئے آنکھوں میں پیار سمو کر بیوی کی چارپائی پہ نظر ڈالی تو شہتیر سے بندھی زنجیر جھول رہی تھی اور نوشی کا بستر خالی تھا۔ بچہ سو رہا تھا۔ طابش سر تھام کے رہ گیا۔

نوشین ایک بار پھر اُسے دھوکا دے کر جا چکی تھی۔ طابش بچے کو دیکھ کر ایک ایسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ کہ دیر تک کمرے میں وال کلاک کی ٹک ٹک چھائی رہی۔

نظمیں / ڈاکٹر کوثر محمود

پنکچر شاپ

بڑے صاحب! یہاں، اس شہر کے مصروف
چوراہے پہ
قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے جھانکتی سی
بشترفٹ پاتھ کو گھیرے،
یہ اک چھوٹی سی پنکچر شاپ ہے میری
بسا اوقات جس کو بلدیہ
خوش باش اہلِ شہر کی نازک خرامی میں رکاوٹ جان کر
چالان کرتی ہے
عدمِ تعمیل پر تذلیل کا سامان کرتی ہے

بڑے صاحب! بڑی مجبوریوں کے کشٹ کاٹے ہیں
کہ میں نے بچپنا
میلے کچیلے ہوٹلوں میں، گاڑیوں کی
ورکشاپوں میں گزارا ہے
جہاں اک حرفِ شیریں بھی سماعت تک نہیں پہنچا
سو میں چوتھی جماعت تک نہیں پہنچا
مرا مولا کرم کر دے، میں ہر اک حال میں راضی
کرم خوردہ صحیفوں میں جو اک بحرِ عطا ہے، وہ نہیں لینا
مجھے آئین نے جو کچھ دیا ہے، وہ نہیں لینا
بس آئے روز کے چالان بھتے سے بچا دیجے
مرے روزی کے اڈے کو ذرا پکا کرا دیجے

بڑے صاحب! نہیں میں آپ سے اُجرت نہیں لوں گا
بس آئندہ میرے لائق کبھی کچھ کام نکلے تو
یہیں تشریف لائیے گا
بڑے صاحب!

میرے بچے کے سکول کا ترانہ

یہ دنیا میری دنیا ہے
میں اس دنیا کا وارث ہوں
یہ دنیا میری دنیا ہے
اس دھرتی کی ساری خوشیاں اور
سارے مصائب میرے ہیں
سب روشن روشن تہذیبیں، آثار و مذاہب میرے ہیں
اس دھرتی پر رہنے والے سب لوگ
میرے ماں جائے ہیں
اور لاکھوں نوری سالوں پر سیار و ثوابت سے آگے
گر ہیں، تو مرے ہمسائے ہیں

ہر لمحہ جو تقویم سے باہر ہے
اب اُس کی ہر ممکن ترمیم سے آگے جانا ہے
اجماع کی ہر صورت کے لیے
تفریق سے آگے جانا ہے، تقسیم سے آگے جانا ہے
تاریخ مرا زورِ بازو، تعلیم اُجالا اور خوشبو
تحصیلِ ہنر میرا مقصد
میں دانش جو، میں دانش جو
یہ دنیا میری دنیا ہے، میں اس دنیا کا وارث ہوں

مجموعہ ہائے کلام

ڈاکٹر کوثر محمود

مشمولہ

کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

اور

صبحِ جمال کی پہلی ساعت

زیرِ طبع

نستعلیق مطبوعات، لاہور

افسانہ

بغاوت

احمد عدنان طارق

حضرت انسان کے جسم میں آج کل ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ یہ اُن کے نظام انہضام نے برپا کی ہوئی تھی۔ نظام انہضام کے تمام ارکان آج بپھرے ہوئے تھے۔ کسی ایک کا منہ سیدھا ہوتا تھا تو دوسرا ناراضگی ظاہر کرنے لگتا تھا۔ سب کی ناراضگی آج کل پورے جسم کے اعضا کے سردار دماغ سے تھی۔ معدے میں کچھ دنوں سے الم غلم چیزیں آنے کی بھرمار تھی اور معدے کا گلہ دماغ سے یہ تھا کہ وہی حضرت انسان کو اُکسا رہا ہے کہ وہ لکڑ ہضم اور پتھر ہضم ہو جائے۔ کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ کرے۔ کام کی شدت کے مارے معدے کا برا حال تھا۔ سارا دن محنت مشقت کرنے کے بعد اُسے کچھ آرام نصیب بھی ہوتا تو بیدار ہونے پر وہ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو لبالب پاتا اور پھر سے وہ کام میں جت جاتا۔ مختلف قسم کی رطوبتیں اُس کی دیواروں سے ان الم غلم چیزوں کو ہضم کرنے کے لیے نکلتیں جس سے کئی دفعہ تو معدے کا سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا۔ سانس کی نالی کا ہونا بھی نعمت خداوندی سے کم نہیں تھا اور شکر ہے کہ دماغ اس معاملے میں ہمیشہ سب کو صحیح معلومات دیتا ورنہ حضرت انسان کے بس میں ہوتا تو وہ سانس کی نالی میں بھی غذا کے لیے راستہ بنالیتا۔ اتنا کام کرنے پر بھی معدہ بجائے سمارٹ ہونے کے بے ڈول ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ بے وقت اور لاپرواہی سے کھانے سے معدہ کبھی خالی ہو نہیں سکتا تھا۔ ہر وقت پھولے کا پھولا ہی رہتا۔ زندگی میں اس سارے رنج والم کا واحد ذمہ دار وہ دماغ کو گردانتا تھا کہ اُس کا فرض تھا کہ وہ حضرت کو سمجھاتا کہ یہ معدہ بے گانہ نہیں بلکہ اُس کا اپنا ہی ہے۔ اسی طرح جگر اپنی جگہ بہت غصہ میں تھا۔ اُلٹی سیدھی چیزوں کو ہضم کرنے کے لیے نہ صرف اُسے کئی رطوبتیں بنانی پڑتی تھیں اور اُسے معدہ کی ہر وقت مدد کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ اُس کا کام جسم میں خون بنانا بھی تھا۔ اب اگر حضرت انسان ہلکی پھلکی غذائیں کھانے کا عادی ہو تو ظاہر ہے کہ جگر کی رطوبتیں خارج کرنے کے لیے کم محنت کرنی پڑے۔ بازاری چیزیں جن میں چکنائی ہی چکنائی ہو جگر صاحب اُن کو ہضم کرنے کے لیے کام کریں اور بدلہ میں جب ان چیزوں کو اگر معدہ ہضم کر بھی لے تو یہ اتنی کنجوس ہوتی ہیں کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بناتیں۔ جس کا نتیجہ جگر کی روکھی اور تولیے جیسی شکل کی صورت میں نکلتا ہے اور اگر یہ ستم کم ہے تو پھر جو پانی کی بالٹیاں کھانے کے فوراً بعد موصوف اپنے اندر انڈیلتے تھے تو کئی دفعہ جگر بے چارے کی بڑی خواہش ہوتی کہ کاش وہ جسم کے باہر جا کر دیکھے کہ خدا نے اس شریف آدمی کو آنکھیں بھی بخشی ہیں یا صرف سفید چھڑی ہی ہاتھ میں تھما دی ہے۔ جگر کو پورا یقین تھا کہ جب تک اُسے کالا یرقان نہ ہو اتنی دیر تک موصوف کیا مجال ہے جو ایک گھونٹ انار کے جوس کا معدے میں جانے دیں۔

اب بڑی آنت اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد تعمیر کرکے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اُسے گلہ نہ ہو مگر ان صاحب کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ پہلے تو جو زمانے کی فضول مرچوں سے لبریز چیزیں معدے میں ٹھونس لیتے اور پھر سی سی کی آوازیں صرف زبان سے نہیں بلکہ پورے جسم سے آنے لگتیں۔ تو پیپسی کی بڑی بوتل تو انہیں صرف اتنا کھا کر ڈکار مارنے کے لیے درکار تھی۔ جب موصوف چھوٹے سے تھے تو کئی دفعہ مسجد میں جاتے اور مولوی صاحب سے رسول کریم کی احادیث سنتے کہ کھانے کے فوراً بعد پانی نہیں پینا چاہیے۔ جب رسول کریمؐ نے یہ فرمایا تھا تو انہوں نے شاید کسی نارمل انسان کے بارے میں بات کی ہوگی جو بسیار خور بھی نہیں ہوگا۔ مگر یہاں تو بسیار خوری کے تمام ریکارڈ ٹوٹ چکے تھے اور اوپر سے کھانے کے فوراً بعد پانی اور کولڈ ڈرنکس جسے وہ کھانے کے ہاضمے کا ذریعہ سمجھتے تھے لہٰذا بڑی آنت جسے خوراک معدہ سے ذرات کی صورت میں ملنی چاہیے اور اُس کا کام صرف اُسے آگے دھکیلنا ہونا چاہیے کو بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ محلول نما چیزیں کہاں سے تیرتی ہوئی آ رہی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی دماغ سے ناراض تھی کہ وہ ہی ان حضرت کو کچھ سمجھائے۔ ان سے بڑا کام تو ابھی بھی جناب لبلبہ صاحب فرماتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ جو صاحب بھاڑ کھائے بیٹھے تھے وہ تھے جناب پتہ صاحب! موصوف کی پوزیشن جسم میں ایسی تھی جیسے تھانے میں کسی ایس ایچ او صاحب کی۔ وہ اپنی مرضی سے کام کرنے کے عادی تھے۔ یہ کبھی فعال ہوتے ہوں گے جب حضرت انسان کی خوراک میں گھاس پھوس شامل تھا اور وہ شاید اپنی ابتدائی ارتقائی شکل میں

ہوتا ہوگا۔ اُس وقت یہ صاحب کچھ رطوبت وغیرہ خارج کرتے ہوں جن سے وہ خوراک ہضم ہوتی ہو۔ اب یہ نظام انہضام کا باقاعدہ حصہ نہیں رہے بلکہ صرف اُس کی تھوڑی بہت مدد کرتے ہیں۔ آج کل ان کا کام باقی سب اعضاء پر رعب ڈالنا تھا۔ یہ ہر وقت اس چانس پر تھے کہ کب بیمار ہوا جائے اور جب بیمار ہوتے تو پھر ان کی چیخیں نکلوا دیتے۔ کیونکہ فوراً یہ ایک پتھر جیسی شکل اختیار کر لیتے اور پھر یہ کبھی خوراک کو کسی جگہ روک دیتے کبھی دل کرتا تو سارا دن کے نمکیات جو پیشاب کی صورت میں خارج ہونے چاہیے وہ روک کر بیٹھ جاتے اور موصوف کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل آتیں۔ غصہ ہر وقت ان کے ناک پر رکھا رہتا تھا اور ان کی زندگی میں بھی ساری تلخی پھیلائے رکھتے تھے۔ غرض فائدہ ایک آنے کا نہیں اور نقصان ہی نقصان۔ یورپی ممالک میں یہ صاحب بڑے دُبکے بیٹھے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہاں حضرت انسان اس حد تک عقل مند ثابت ہوا ہے کہ بچپن ہی میں ان کو جسم سے ایک چھوٹا سا آپریشن کر کے دیس نکالا کر دیا جاتا ہے تا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ مگر یہاں اصل میں آج کل انہیں ہی نے ساری احتجاجی تحریک چلائی ہوئی تھی۔ ان کی حرکات کا دماغ پر بھی اثر ہو رہا تھا۔ نہ جگر کام کر رہا تھا نہ معدہ اور ان کے کام نہ کرنے سے دماغ بھی ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ حضرت انسان کمزور سے کمزور ہو رہے تھے۔ دورے وغیرہ بھی پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ سارے اعضاء کے یکجا ہونے کا سب سے زیادہ نقصان سب سے کمزور بیچاری بڑی آنت بھگت رہی تھی۔ جگر کا چہرہ بھی صاحب خراش ہو رہا تھا۔ مگر بڑی آنت تو بیچاری زخموں سے چور چور تھی دنیا میں ہر انسان کی کارکردگی تو بیرونی دنیا میں اُس کے مکمل قول و فعل سے ہی جانچی جاتی ہے۔ لہٰذا اب یہ حضرت انسان اپنے ملنے ملانے والوں میں باقاعدہ بیمار کا رُتبہ حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا کبھی انہیں پاگل خانے لے جانے کا سوچا جا رہا تھا تو کبھی ہسپتال میں داخل کرانے کا۔ ان جناب کا دماغ صاحب کی حرکات سے ہر وقت غصہ میں رہتا اور انہی کی مشہور معروف درد کی ٹیسیں انہیں ہر وقت بلبلانے پر مجبور کر دیتیں۔ یہ ان دردوں کا اپنا انفرادی کارنامہ سمجھتے تھے اور پھر وہی ہوا آخر انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگر وہ دماغ کو چاروں شانے چت کر سکتے ہیں تو پھر وہی حضرت انسان کے اندر تمام اعضاء کے بادشاہ ہیں۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ اُن کی پتھریلی وضع قطع سے موصوف کی آنکھیں باہر نکل آتی ہیں۔ سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ منہ سے ہائے ہائے کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ یہ موقع اچھا ہے کہ دماغ سے بادشاہت چھین لی جائے۔ مگر سچی بات تو یہ تھی کہ دماغ جیسا بھی تھا باقی اعضاء کو آرام بھی فراہم کرتا تھا۔ اگر کسی وقت کسی برے سگنل والے کی طرح کوئی غلطی ہو بھی جاتی تو فوراً کام کرنے لگتا اور کوشش کرتا کہ اس عضو کو کس طرح اس مشکل سے نکالا جائے۔ دوائی کی طرف انسان کی توجہ دلاتا۔ موصوف اُس کے کہنے پر ہی ایسا منہ بنا لیتے کہ گھر والے بدہضمی پر کوئی ہاضم شے کھلا دیتے۔ کوئی دارچینی کا قہوہ پلا دیتا یا سبز چائے پلائی جاتی جس سے کچھ عرصہ کے بعد وہ ہی عضو کو سکون میسر کر دیتا۔ نام اُس کا پتا (باپ) جیسا تھا مگر عمل دشمنوں جیسا مگر پتے کا کام صرف دکھ دینا تھا آخر تھک ہار کر ان کے دماغ نے بھی ہمت پکڑی اور جب اُن کو سمجھ آ گئی کہ اب اُن کی حرکتیں انہیں پاگل خانے یا پھر ہسپتال لے جائیں گی تو اُن کے اندر بچنے کے لیے دماغ نے ضرورت سے زیادہ محنت شروع کی۔ آہستہ آہستہ اُس نے سب اعضاء کو تیزی سے صحیح راستہ دکھانا شروع کیا۔ اب حضرت انسان جب کبھی کوئی غلط ملط شے اپنے اندر انڈیلتے تو تمام اعضاء ایکا کر کے اُس کا بائیکاٹ کر دیتے اور فوراً قے کی صورت میں شروع سے ہی ہر شے واپس کر دیتے۔ پھر حضرت کو دماغ نے باور کروا دیا کہ پاگل خانے سے بہتر ہسپتال جانا چاہیے تا کہ وہاں سے بہتری کی اُمید پیدا ہو۔

حضرت انسان کا جائزہ ڈاکٹروں نے لیا تو فوراً بیچاری بڑی آنت کے زخموں پر اُن کی نظر پڑ گئی۔ صاحب خراش جگر کو دیکھا تو انہیں اس پر بڑا ترس آیا اور فوراً انہوں نے اپنا دست شفقت ان دونوں پر رکھ دیا۔ ڈاکٹروں نے کوشش کی کہ کسی طرح پتے کو بھی منا لیا جائے تا کہ وہ اپنی اوقات میں رہ کر جسم میں ایک طرف پڑا رہے لیکن جب اُس کا موڈ صحیح نہ ہوا تو اُنہوں نے سوچا کہ آخر اس کا مصرف کیا ہے۔ یہ خوا مخواہ کا بادشاہ سلامت بنا ہوا ہے تو انہوں نے آدھ گھنٹے میں اُسے جسم سے نکال باہر کیا۔ اس طرح اس شرارتی عضو کی بغاوت ختم ہوئی۔ جگر کو بھی اپنی تھوڑی سی قربانی دینی پڑی جو اس نے پتے کا ساتھ دیا تھا۔ دماغ معمول پر آ گیا اور حضرت انسان نے آئندہ بدپرہیزی سے توبہ کی۔ معدہ اب سکون میں ہے اور معیاری کام کر رہا ہے۔ لبلبہ اور جگر خوب خون پیدا کر رہے ہیں۔ البتہ بیچاری بڑی آنت آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہی ہے۔ راوی اب چین ہی چین لکھ رہا ہے اور موصوف اب دنیا میں تو کامیاب ہی ہیں۔ دین کی طرف بھی توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔

افسانہ

ادھوری کہانی

نیازت علی نیازؔ

''اس کردار نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہانی کو کس موڑ پر لے جا کر ختم کیا جائے اور اس کردار کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے،، وہ میرے سر کے اوپر سے سامنے والی دیوار کو گھورتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں مجھ سے مخاطب تھا۔

ہم دونوں اس وقت لیب میں بیٹھے ہوئے تھے اور کلاس کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پریکٹیکل کے لئے ریجنٹ وغیرہ ہفتہ بھر پہلے ہی بنا دیئے گئے تھے سو اب فراغت ہی فراغت۔ اسے میرے ساتھ آئے کوئی چھ ماہ کا عرصہ گزرا ہوگا۔ یہ ایک میڈیکل کالج ہے جس کے بائیو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں میں لیب اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتی ہوں۔ ہمارے سابقہ ٹیکنیشن مستعفی ہوئے تو یہ صاحب آکر براجمان ہوگئے تھے۔ ان کو دیکھ کر عجیب سی الجھن ہوتی۔ بے ترتیب بال، شکن آلود لباس، چہرے کے تمام عضلات کھچاؤ کا شکار، اپنی عمر سے تین گنا بڑے نظر آتے۔ طبیعت میں بے چینی، چہرے سے شدید کرب چھلکتا، ہنسی اول تو مفقود تھی پر اتفاقاً جو مسکرائیں تو مسکراہٹ کے نام پر بھی عجیب سوگواری لکیر بنتی۔ شروع شروع میں تو مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ یہ شخص مجھے ابنارمل لگا ، مجھے ہول اٹھتے کہ چھ گھنٹے ایک کمرے میں اس کے ساتھ گزارنے ہیں مبادا یہ ہوتق اور خبطی سا آدمی کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے مگر رفتہ رفتہ میں اس تکلفانہ رفاقت کی عادی ہوتی چلی گئی اور یہ اطمینان بھی حاصل ہوگیا کہ یہ ایک بے ضرر انسان ہے۔ لیکن اب مسئلہ تھا گفتگو۔ شروع میں تو ہوں ہاں تک رہی مگر چپ کہاں تک رہا جا سکتا ہے سو آہستہ آہستہ گفتگو کا سلسلہ چلا تو معلوم ہو موصوف افسانہ نگار ہیں۔ چلو کوئی تو موضوع ملا جس پر بات کی جا سکے مگر یہ بات بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ گاڑھے فلسفے میں لتھڑی عجیب بے سروپا سی الجھانے والی گفتگو۔ میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں اور اب مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ خاموش رہنا مشکل، بات کرنا بلائے جاں، لیب چھوڑ کر کہیں اور جاؤں تو نوکری سے ہاتھ دھونے کا خطرہ۔ مرے خدا میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔ آخر کو مجبوراً اس کی گفتگو میں شامل ہونا پڑتا کہ چپ کے عذاب سے یہی بہتر ہے۔

میرے ابھی تک کے تجربے میں یہ سب سے انوکھا تجربہ ہے،، اُس نے بات جاری رکھی۔ ایک کردار کو کہانی کیا مگر اب سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے،،

''اچھا کردار کیا'' میں نے پوچھا۔ ،،یہ کردار ایک ایسے شخص کا ہے، جس کی کھوج نے اس کو مسلسل حیرتوں سے دوچار کیا ہے۔ وہ آگہی کے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں جانکاری عذاب ہوتی ہے،،

،،یہ تو ایک کھلا کردار ہے اس میں کونسی مشکل پیش آرہی ہے،، مشکل یہ ہے میں اسکے عشق پر لکھنا چاہتا ہوں۔،، تو اس میں کیا ہے،، اصل میں اسکا عشق بھی پیچیدہ ہے۔ اسکی زندگی میں دو کردار ہیں ایک وہ جسے وہ چاہتا ہے۔ بے حد بے حساب مگر اظہار سے قاصر ہے۔ ،، کیوں؟،، میں نے اس سے سوال کیا۔ ،، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ محبت میں رسائی سم قاتل کا کام کرتی ہے سو وہ نارسائی کو محبت کا آبِ حیات گردانتے ہوئے اسی خلش سے تسکین پانا چاہتا ہے،،۔۔۔ یہ تو پانے نہ پانے کی بات ہوئی اظہار نہ کرنے کی وجہ،،۔۔۔ جب مقصود محبت ہے رسائی نہیں تو اظہار چہ معنی دارد،،۔۔۔۔،، یہ تو محبت سے محبت ہوئی نا کہ محبوب سے؟،،۔۔ بات تو تمہاری ٹھیک ہے یہ محبت سے محبت ہے لیکن اس محبت کو اجاگر کرنے کا باعث تو محبوب ٹھہرا سو بنیاد تو وہی ہے۔۔۔ تو وہ اسے چاہتا ہے۔۔۔ بے حد۔۔ آپ کسی دوسرے کردار کا بھی ذکر کر رہے تھے۔۔ ہاں! دوسرا کردار وہ ہے جو میرے کردار سے محبت کرتا ہے اور اسے پانے کا خواہش مند ہے۔ وہ اپنے جذبوں کی تمام تر سچائی اور شدت سے اسے چاہتا ہے۔ اس نے میرے کردار کو اپنی طرف مائل کرنے کے تمام حربے آزمائے ہیں مگر وہ اس پتھر میں جونک لگانے سے قاصر رہا۔ میرا کردار اسکی آنچ حرارت کو محسوس کرنے کے باوجود کنارہ کش رہا۔ شاید اس کا سبب

اس کی اپنی محبت رہی ہو۔۔۔،، پھر؟،، پھر میرے کردار کے محبّ اور محبوب دونوں کسی اور کے ہو گئے تو اسے پچھتاوے کے انگاروں پر لوٹنا پڑا۔۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی،، اس نے خود ہی تو نارسائی کو محبوب کیا تھا پھر پچھتاوا کیسا،،۔۔۔ دراصل اسے بہت بعد میں جا کر اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ وہ انسان ہے اور انسان کا عشق سوائے کارِ ہوس کچھ بھی نہیں۔

یہ تو بڑی عجیب بات ہے،،۔۔۔نہیں یہ بات عجیب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اصل میں عجیب تو یہ ہے کہ ہم عورت اور مرد کی فطری کشش سے جنم لینے والے جذبے کو عشق کا نام دے کر زبردستی کی پاکیزگی کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ جبکہ اس جذبے کی بنیاد جنس ہے اور دونوں جنسوں کا ملاپ ہی تکمیل ہے۔ نارسائی نہیں۔ نارسائی کا مارا شخص عمر بھر ادھورا رہتا ہے سو وصل ہی تکمیل ٹھہری اور اس سے پہلے کا سارا عمل کسی موزوں ساتھی کا انتخاب بلکہ اپنی پسلی سے نکلی حوا کی تلاش اور پھر موت کا سفر۔ کسی نئے وصال کا سفر۔

کہانی تو ختم ہوگئی۔ محبّ محبوب دونوں غائب۔ پچھتاوا انجام۔ میں نے کہا۔ اگرچہ مجھے لکھنے لکھانے کا کوئی تجربہ نہیں مگر اس کے ساتھ رہتے ہوئے اس طرح کی باتیں کرتے کرتے میں بھی کسی حد تک کہانی کی بُنت کو سمجھ گئی تھی۔

یہی تو بات ہے۔ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ میرے کردار کو ایک بار پھر محبت ہوگئی ہے۔ اب وہ کسی اور کو چاہنے لگا ہے۔ اسی پہلے والی شدت کے ساتھ۔۔۔۔ اس بات پر میں چونک گئی اور ساتھ میری دلچسپی بھی بڑھنے لگی۔۔۔ مگر وہ تو محبت کر گزرا اور محبت تو صرف ایک بار ہوتی ہے۔۔۔۔ یہ بھی غلط۔ ہم ایسا کہتے ہیں پر ایسا ہوتا نہیں۔ محبت ایک بار نہیں کئی بار ہوتی ہے ہمیشہ اپنی پہلی شدت کے ساتھ۔۔ اور پھر میرے کردار کی پہلی محبت تو ادھوری تھی۔

پھر اس بار وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں وہ اس بار اسے پانا چاہتا ہے۔ وہ نارسائی کے عذاب سے چھٹکارا چاہتا ہے۔۔۔ تو پھر اس کو اظہار کرے۔۔۔ ہاں مگر یہی تو مسئلہ ہے وہ تو اظہار کرنا چاہتا ہے مگر ڈرتا ہے۔۔۔ کس بات سے۔۔۔ ٹھکرائے جانے سے۔۔۔ اگر انکار ہوگیا تو۔۔۔ تو وہ خود کو ختم کر دے گا۔۔۔ اچھا؟۔۔۔ ہاں! میرے کردار کی ذہنی حالت اب ایسی ہی ہے۔

فرض کرو میرے کردار کی نئی محبت تم ہو تو ایسی صورت میں تم کیا فیصلہ دو گی؟۔۔۔۔۔ میں اس سوال کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ میں نے حیرت اور غصے سے ملے جلے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ فرض کرو۔۔۔ میں نے صرف فرض کرنے کا کہا ہے۔

تو میں اسے نارسائی کے اسی فلسفے تلے دبا کر چھوڑ جاتی جس تلے اس کی پہلی محبتیں دفن ہیں۔۔ اس صورت میں تو وہ مر جائے گا۔۔۔ یہ اس کی اپنی منتخب کردہ راہ ہوگی۔۔۔ میں یہ کہہ کر اٹھی اور آنے والی کلاس کو پریکٹیکل کروانے میں مصروف ہوگئی۔۔

دوسرے دن جب میں کالج پہنچی تو ایک خبر مجھ پر گری۔۔۔ رات افسانہ نگار نے خودکشی کر لی۔

غزلیں/ زاہد سعید زاہد

وقت نے ارزاں کیا، کیسی گرانی میں مجھے
دے دیا اُس نے کسی بھولی نشانی میں مجھے
میں کسی اور کہانی کا ہوں کردار، مگر
اُس نے رکھا ہے کسی اور کہانی میں مجھے
میں کناروں سے نکل کر بھی کناروں میں رہا
چاند نے قید کیا، جھیل کے پانی میں مجھے
میں مہاجر بھی نہیں ہوں کہ میں ہجرت کرتا
عمر بھر رکھا گیا نقل مکانی میں مجھے
اپنی مٹھی میں لیے پھرتا تھا میں نجم و قمر
تم نے دیکھا تھا کہاں عین جوانی میں مجھے
میں تو دم بھر کے لیے رہ میں رُکا تھا زاہدؔ
وقت کیوں بھول گیا، اپنی روانی میں مجھے

....

اس سے پہلے کہ کسی آنکھ سے آنسو نکلے
کاش اس تیرہ شبی میں کوئی جگنو نکلے
عدل کا جس کے بہت شور سنا تھا ہم نے
اس کے انصاف کے بھی کتنے ترازو نکلے
میں یونہی غیر سے بدظن ہوئے بیٹھا تھا مگر
مسئلے سارے پسِ پردہ گھریلو نکلے
دشمنی اُس سے مری اپنی جگہ ہے لیکن
اس کو مغموم جو پایا، میرے آنسو نکلے
وہ سمجھتے ہیں کہ میں اُن سے خفا ہوں، لیکن
میں ہوں خاموش کہ کچھ بات کا پہلو نکلے
جتنے ہاتھوں میں بھی تھا، صلح کا پرچم زاہدؔ
غور سے دیکھا تو سب میرے ہی بازو نکلے

افسانہ

آئینے میں ٹھہری ہوئی تصویریں

شہزاد ملک/ خیر پور ٹامے والی

جیل کی چھوٹی سی کوٹھڑی کے روشن دانوں سے روشنی کی کرنیں دن نکلنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ ہولے ہولے سی کھلتی ہوئی بوڑھی آنکھیں......!

ان آنکھوں کے آسمان پہ یادوں کے لال بادل اُبھرنے لگے اور ہلکی سی رِم جھم سے نظر دُھندلی ہونے لگی تو اُس نے اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلا۔ اُن آنکھوں میں انتظار بھی انتظار کرتے کرتے مایوسی کی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ اُن آنکھوں میں انتظار کی عمر دو ہزار پانچ سو پچپن دن تھی۔ گزشتہ شب وہ بھی اپنی آخری سانسیں اُمید کی گود میں ہار گیا۔ اُمید بھی تو اُن آنکھوں میں بوڑھی ہو چکی تھی مگر نئے دن کی روشنی کی چمک اُس سوئی ہوئی بڑھیا کو جگا ضرور دیتی تھی۔

گلہ خشک ہونے لگا تو اُس نے گھڑے سے پانی مٹی کے گلاس میں ڈالنے کی کوشش کی مگر پانی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ صرف دو گھونٹ پانی سے وہ اپنے گلے کو تر کر سکا۔ حوالدار نے سیٹی بجائی جاگو قیدیو جاگو......

چلو سب لیٹرین لائن میں لگ جاؤ پانی صرف آدھے گھنٹے کے لیے آئے گا سرکاری پانی بہت کم آنے لگا ہے۔

چلو چلو نصیب اپنا اپنا......! بھگدڑ مچ گئی سارے قیدی حوالات سے نکل کر تھانے کے پچھواڑے میں بنے لیٹرین کی طرف جانے لگے۔ مگر وہ کوٹھڑی میں ہی رہا نئے دن کا اُجالا زخموں کو پھر سے ہرا کر دیتا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اونچی آواز میں پکارا قیدی نمبر 106 باہر حاضر ہو تمہاری پیشی ہے آج۔ حوالدار اُس کے پاس آیا ماسٹر جی مبارک ہو نئے سال کی خوشی میں نئی حکومت نے چند قیدیوں کی سزائیں معاف کر دی ہیں۔

آپ کو جی آزادی مبارک ہو۔ انسپکٹر صاحب دے کمرے اچ جاؤ فارم تے انگوٹھا لاؤ تے جاؤ ہن گھراں نوں۔ ماسٹر کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے تیز دھوپ میں بارش ہو رہی ہو۔ آج وہ جیل سے تو رہا ہو گیا۔ مگر اُن گزرے سالوں میں جو وقت اُس پہ گزرا وہ تو اب بھی اُس کی قید میں تھا۔ جیل سے باہر کا منظر اُس کی سوچ کے بالکل مختلف تھا۔ سامنے ہی ایک جمعدار نالی صاف کرنے میں مصروف تھا۔ وہ گند کو ایک چھاج میں ڈال کر چھان رہا تھا۔ شاید اُس میں سے کچھ کام کا نکل آئے اُسے لگا جیسے وہ بھی ایک جمعدار ہے اور اسے اپنا کھویا ہوا سب کچھ تلاش کر رہا ہے۔ شاید اپنا گھر......ساتھ ہی فٹ پاتھ پر ایک پنکچر لگانے والا بیٹھا تھا۔ آہ......! کاش گزرے ہوئے وقت کو بھی پنکچر لگ سکتا۔ وہ عجب سکتے کی حالت میں تھا۔ باہر آ کر بھی کچھ خاص نہ بدلا تھا ویسے ہی مرجھائے ہوئے چہرے۔ اُسے عجیب سی گھٹن ہونے لگی۔ جگہ جگہ پر اُسے خوابوں کی لاشیں نظر آنے لگیں۔

ہر طرف گہما گہمی اور ایک دوڑ سی لگی ہوئی تھی۔ سب مشین کی طرح کام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ نئے سال نے آخر کیا دیا تھا کیا بدلا تھا کچھ بھی تو نہیں سنورا تھا اس چمن کا......! خزاں ہی جیسے ٹھہر گیا ہو۔ جیسے خزاں میں پتے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ ویسے ہی فٹ پاتھ بھرے ہوتے تھے اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ آہ......! یہ معصوم بچے...... میلے کپڑوں میں مرجھائے ہوئے پھول۔ کندھوں پہ کوڑے کا تھیلا اُٹھائے پھر رہے تھے کیا یہی ترقی ہوئی تھی۔ ارے کہاں گئے وہ لوگ جو خود کو اس چمن کا مالی کہتے تھے۔ وہ وہیں ماتھے پہ ہاتھ رکھے ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھ گیا۔ سامنے پٹرول پمپ پر لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ نئے سال کی خوشی میں پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پٹرول شارٹ بھی تھا۔ اس کے پاس ہی دو نوجوان آ کھڑے ہوئے۔ دونوں آپس میں نئے سال کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ اُس کے کان بھی اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔ ارے یار نئے سال کا نیا بجٹ منظور ہو گیا ہے۔ ہر چیز پہ ٹیکس......کوئی بھی تو سہولت نہیں۔ ہماری مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں یہ لوگ...... نئے سال نے نئی اُلجھنوں میں ڈال دیا ہے۔ اب تو خدا کرے نیا سال ہی نہ آئے۔ یہ سیاستدان جھوٹے وعدے کر کے مکر جاتے ہیں دل تو کرتا ہے بندہ خودکشی کر لے۔ دوسرا نوجوان بھائی یہاں تو زہر بھی مہنگا ہے۔ یہ بھی اتنا آسان نہیں۔ یہ سنتے ہی اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے سر میں کوئی سوئی چبھو دی گئی ہوئی ہو۔ اس کی آنکھیں غصے سے بھر

گئیں۔

دوسرا نوجوان ارے یار انتہا کی لوڈ شیڈنگ اور اوپر سے اتنا بل...... بجلی نہ ہوئی جیسے کوئی مہنگی دوائی ہو گئی۔ خوب جانتے ہیں یہ سیاست کے ڈاکٹر بیمار کو علاج کے لیے دوائی تو لینا ہی پڑتی ہے۔ ارے ہاں بھائی سولہ آنے سچ بات کی تم نے۔ بجلی ہمیں دی بھی تو دوائی کی طرح جاتی ہے۔ ایک خوراک دو گھنٹے صبح ناشتے میں دو گھنٹے دوپہر اور دو گھنٹے رات سونے سے پہلے۔ ہاہاہا...... دونوں قہقہہ مارنے لگے۔

ان نوجوانوں کے پاس ہی کھڑے ایک بزرگ جو کہ ان کی باتیں سن رہے تھے بولے بیٹا یہ سارے سیاستدانوں کا بھی قصور نہیں۔ ہمیں ہی عادت ہو گئی ہے دھوکہ کھانے کی۔ گزرے پینسٹھ برس میں ہم نے کھایا ہی کیا ہے دھوکہ......! خود میں بھی تو کوئی خاص تبدیلی نہیں لائے ہم۔ ہمیں عادت ہو گئی ہے ظلم برداشت کرنے کی۔ ہم اتنا پک چکے ہیں کہ ہر لحہ کسی نہ کسی بری خبر کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ رہی بات الیکشن کی یہ تو بس ایسے ہے جیسے ایک نیوز چینل سے دوسرا نیوز چینل تبدیل کرنا۔ کیسے الیکشن ہیں یہ ہر بار ہمیں ہی اپنی قسمت داؤ پر لگانا ہوتی ہے۔ دونوں طرف ہوتی تو موت ہی ہے ہم خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں کبھی اس طرف تو کبھی اُس طرف۔

تو بابا جی آپ ہی بتاؤ کیا کریں کدھر کو جائیں ہم......؟ بیٹا آواز اُٹھانی چاہیے۔

ہاہاہا...... نوجوان ہنسنے لگے۔ او اللہ والے او یہاں اُٹھنے والی آواز ہمیشہ کے لیے دبا دی جاتی ہے۔ آہ......! ایسا لگا جیسے کسی نے ماسٹر کی دُکھتی رگ پہ کوئلہ رکھ دیا ہو۔ وہ فوراً وہاں سے اُٹھا۔ اُس کا جسم ماتم کناں تھا وہ اپنا جنازہ آپ ہی اُٹھائے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن بھی تو اس کی طرح بوڑھا ہو چکا تھا۔ خستہ حال بنچ پہ اُس کے ساتھ کے دو اور بوڑھے بھی بیٹھ گئے تھے۔ یہ بڑھاپا بھی زندگی کی ٹرین کا آخری اسٹیشن ہے جہاں موت آپ کا انتظار کر رہی ہوتی ہے یا آپ موت کا۔ بڑھاپے کا مسافر زندگی کے آخری اسٹیشن پہ اُس گاڑی کے انتظار میں ہوتا ہے جہاں موت سے آگے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اکثر موت کی گاڑی آنے میں تاخیر کر دیتی ہے تو مسافر انتظار کے اس وقت کو گزارنے کے لیے زندگی کی کتاب کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ بچپن کا سفر...... جوانی کا سفر...... بڑھاپے کے مسافر کے سر کے بال اکثر سفید ہوتے ہیں۔ یہ سفید بال نہیں بلکہ زندگی کی کتاب کے وہ ورق ہوتے ہیں جن پہ وقت کی سیاہی اور تجربے کی قلم سے بہت سے سبق لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ تینوں بھی مایوسی کے بنچ پہ بیٹھے موت کی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے دوسرے سے پوچھا تمہاری زندگی میں تمہارا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ دوسرا بوڑھا میرا دشمن ''کاش'' تھا۔ کاش یہ کاش میری زندگی میں نہ ہوتا۔ دوسرے بوڑھے نے طنز کرتے ہوئے کہا لگتا ہے تم خزاں کے موسم میں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں ہی قہقہہ مارنے لگے۔ دوسرا بوڑھا...... ارے تم نے ٹکٹ بھی لیا ہے یا نہیں؟

ارے نہیں بھائی یہاں بے وقت موت کی ٹرین آتی ہے اور بغیر ٹکٹ مسافروں کو اُچک لے جاتی ہے۔ بس ایک ڈرائیور موت کی ٹرین لاتا ہے اور بے خبر بغیر ٹکٹ مسافروں کو ان کی مرضی پوچھے بغیر ہی لے جاتا ہے۔ دوسرا بوڑھا ہمارے ہاں تو سیاست بھی اب گھر کی وفادار لونڈی ہو گئی ہے۔ ہاں سچ کہا ہمارے ہاں سیاست ایسے ہاتھوں میں ہے جیسے ایک ان پڑھ آدمی کے ہاتھوں میں اخبار۔ وہ اُسے بیچ رہا ہوتا ہے۔ ارے ہاں...... دونوں کے بیچنے کا انداز بھی کتنا ملتا جلتا ہے۔ ماسٹر نے غور سے اُن دونوں کو دیکھا ایک کے ہاتھ میں اخبار بھی تھا۔ اس نے اخبار مانگا فرنٹ پیج پہ ایک ہیڈ لائن اور اس کے نیچے چھپی ہوئی تصویر۔ یہ جونہی نظر پڑی اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چھپی تصویر میں دو فریق گلے مل رہے تھے۔ ماسٹر چیخ اُٹھا۔ یہ فراڈیا شخص یہ تو کہتا تھا کہ یہ ڈکٹیٹر ہے۔ کرپٹ ہے...... نجانے اور کیا کیا کہا کرتا تھا اور آج اسی شخص کے ساتھ بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ یہی تو وہ شخص تھا جس کی آواز کے ساتھ اس نے اپنی آواز ملائی تھی۔ اسی شخص کے نعرے کے پیچھے اُس نے نعرہ لگایا تھا اور گرفتار کر لیا گیا اور آج انہی مخالف پارٹیوں کے اتحاد کی خوشی میں تو قیدیوں کو رہا کیا گیا تھا۔ مگر کون حساب دے گا گزرے ایک ایک پل کا۔ سیاستدان تو پریس کانفرنس میں سیاست کی میز پر اپنی اپنی مطلب کی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ماسٹر کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بہنے لگے۔ اُسے لگا جیسے آج ہی قیامت ہو گئی ہو۔ اتنا بڑا دھوکہ اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ شدید ہارٹ اٹیک کے باعث وہ وہیں لاوارث مر گیا۔ اُس کے آنسو اُس کے گالوں پہ خشک ہو گئے۔ مگر مرنے سے پہلے وہ یہ ضرور جان گیا تھا کہ سیاستدانوں کے آنسو مگر مچھ کے آنسو ہیں اور عوام کے آنسو موم بتی کے آنسو۔ جو اُس کے ہی بدن سے جل کر بہتے ہیں اور وہیں خشک ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ جل کے بہنے کے لیے۔

(بقیہ انٹرویو) فرحت زاہد: میں شروع سے ہی بورڈنگ میں ہوں۔ وہاں میری کافی لڑکیوں کے ساتھ کافی اچھی دوستی تھی۔ غیر شعوری طور پر میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کوئی مصرعہ کہہ جاتی تھی۔ میری اکثر سہیلیاں کہتی تھیں کہ تمہاری باتوں میں ردھم ہے۔ تم لکھنے کی طرف دھیان دو۔ انہی دنوں کالج میں قائداعظم کی سو سالہ تقریب کے سلسلے میں کالج میگزین کے لیے میں نے ایک نظم کہی جسے ہماری اُردو کی لیکچرار میڈم شمشاد نے بے حد پسند کیا اور وہ نظم میگزین میں چھپنے کے لیے منظور ہوگئی۔ بس یہیں سے میری ہمت بندھی اور مجھے حوصلہ ملا کہ مجھے مزید لکھنا چاہیے۔

ارژنگ: مشاعروں اور ادبی جرائد میں کب چھپنا شروع کیا؟

فرحت زاہد: یہ بڑی بعد کی بات ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ہمارا گھر مذہبی تھا۔ لہٰذا مشاعروں کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس زمانے میں بہاولپور ریڈیو اسٹیشن کے پروڈیوسر عقیل اشرف تھے۔ جو اَب کراچی میں ہوتے ہیں۔ وہ نئے ٹیلنٹ کی تلاش میں مختلف جگہوں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے کالج بھی کئی دفعہ آئے۔ خود میرا بھی جی چاہتا تھا کہ میں مشاعرے پڑھوں لیکن مجھے صرف پڑھائی کی اجازت تھی۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں بڑی ذہین سٹوڈنٹ تھی۔ میں تھرو آؤٹ اسکالرشپ ہولڈر تھی۔ لکھنے کا سلسلہ بھی ساتھ چلتا رہا لیکن لکھ کر میں اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ باقاعدہ نہ تو کسی مشاعرے میں سنایا اور نہ ہی کہیں چھپنے کے لیے دیا۔

ارژنگ: اس حوالے سے کب سامنے آئیں؟

فرحت زاہد: یہ غالباً 1981ء کی بات ہے۔ 79ء میں میری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد جب میں یو اے ای میں چلی گئی کیونکہ میرے شوہر وہاں آرمی میں تھے۔ ان دنوں وہاں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مرحوم سلیم جعفری اس سلسلے میں کافی متحرک تھے۔ دُبئی، ابوظہبی میں آئے دن ادبی تقریبات، مشاعرے اور میلے ہوتے رہتے تھے۔ میرے میاں زاہد صاحب خود بھی شاعر تھے اور ان کے تایا شیخ یحییٰ خان بھی شاعر تھے۔ ان کو ایسی تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے ملتے رہتے تھے۔ اسی طرح کی کسی محفل میں، میں نے بھی اپنا کلام سنایا جس کی سامعین نے کافی حوصلہ افزائی کی۔ خاص طور پر ع س مسلم نے مجھے کافی حوصلہ دیا۔ پھر ان کے کہنے پر میں نے باقاعدہ مشاعروں میں جانا شروع کر دیا۔

ارژنگ: کتاب چھپنے کی نوعیت کب آئی؟

فرحت زاہد: میری پہلی کتاب ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' کے نام سے چھپی جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

ارژنگ: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' یہ نام کیسے تجویز کیا؟

فرحت زاہد: کتاب میں میری ایک نظم ہے ''پھلواری'' اس میں یہ لائن ہے۔

''پھول اور شگوفوں پر تتلیاں تو آتی ہیں
تتلیاں ضروری ہیں
خواب گر نہ دیکھیں تو
لڑکیاں ادھوری ہیں''

ارژنگ: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' یہ کہنے کی آپ کو ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

فرحت زاہد: لڑکیوں کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں جو ناروا پابندیاں ہیں اسے سامنے رکھ کر میں نے یہ ایک احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔

ارژنگ: امریکہ میں آپ کی ادبی مصروفیات کیا ہیں؟

فرحت زاہد: لکھنے لکھانے کے علاوہ یہاں سے جو لوگ امریکا جاتے ہیں ان سے ہمارا بہت ملنا ملانا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم نے وہاں ''کاروان فکر وفن'' کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے۔ جس کے چیئرمین وکیل انصاری ہیں۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ہم اب تک وہاں کافی لوگوں کو مدعو کر چکے ہیں۔

ارژنگ: یہاں سے جن لوگوں کو آپ اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں وہ آپ کے لیے کس قسم کے مسائل پیدا کرتے ہیں؟

فرحت زاہد: اصل میں یہاں سے جانے والے کافی توقعات لے کر جاتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں جو زندگی کی مصروفیات ہیں وہاں کئی مجبوریاں ہمارے آڑے آ جاتی ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے نخرے برداشت کیے جائیں۔ پاکستانی شاعر اور ادیب البتہ ایسے گھٹیا پن سے پرہیز کرتے ہیں۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کی وہاں کیا صورت حال ہے؟

فرحت زاہد: وہاں بھی گروہ بندیاں ہیں لیکن سب اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہاں پر ہماری تنظیم کے علاوہ حلقہ فنون ادب، حنیف اخگر، حمیرا رحمان، ظفر میموریل سوسائٹی، ریحانہ قمر، نیر آپا اور شگفتہ فاروقی صاحب ہیں۔

ارژنگ: امریکہ میں اُردو ادب کے بارے میں عمومی رویہ کیسا ہے؟

فرحت زاہد: امریکن ادب سوسائٹی اُردو ادب سے خاصی دور ہے۔ اس کی وجہ میوزک اور فلم ہے۔ اُردو ادب وہاں ابھی متعارف نہیں ہوا۔ اس حوالے سے وہاں بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے۔ ساؤتھ ایشین لینگویجز کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے لیکن یہ زیادہ تر ہندی کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ اُردو کے فروغ کے لیے وہاں کوئی ادارہ تا حال قائم نہیں ہے۔ بنیادی

طور پر یہ سفارت خانے کا کام ہے لیکن ایمبیسی صرف اس حد تک کام کرتی ہے کہ وہ کسی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر آ جاتی ہے۔ امریکہ میں اُردو ادب کے فروغ کے لیے پاکستانی سفارت خانے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ اُمید کی ایک کرن پاکستان مشن کے منصور سہیل کا نام میں ضرور لوں گی۔ یہ کافی اچھے آدمی ہیں۔ ان سے اس سلسلے میں کافی توقعات وابستہ ہیں۔

ارژنگ: اتنے طویل عرصے بعد پاکستان آنا کیسا لگا؟

فرحت زاہد: بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ خاص طور پر لاہور آ کر بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ میرا ایک ہفتہ قیام کا پروگرام تھا لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔

ارژنگ: یہاں کے ادیبوں کے حوالے سے کچھ کہیں گی؟

فرحت زاہد: پروین عاطف ہی کی بات کروں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ فرحت زاہد تمہارے آنے پر پورا لاہور یوں لگ رہا ہے جیسے یہاں باہر کھڑا ہے۔ لاہور کے ادیب اور شاعر بڑے زندہ دل کھلے اور ذہین ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اُردو ادب کا مستقبل لاہور کے ادیبوں کی وجہ سے روشن ہے۔

س: دوسرا شعری مجموعہ کب آ رہا ہے؟

ج: ''عشق جینے کا اک سلیقہ ہے'' میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو کہ انشاء اللہ ۲۰۱۳ء کے اختتام تک شائع ہو جائے گا۔

س: ادبی سین سے آپ کئی سال غائب رہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج: جی عامر، اس کی وجہ وہی تھی جو اکثر خواتین کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی جب بچے بڑے ہوئے اور وہ بھی امریکہ کے ماحول میں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ تمام شاعرانہ سرگرمیاں چھوڑ چھاڑ کر میں گھر داری میں مصروف ہو گئی۔ تلاشِ معاش اور بچوں کی تربیت، وقت جیسے پر لگا کر اُڑ گیا۔ الحمدللہ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں اور زندگی میں انہیں جو بننا تھا بن چکے۔ اب میں شاعری پر توجہ دے رہی ہوں۔ ویسے بھی لاہور کا ماحول ادب کے لیے کافی Inspiring ہے۔ زندہ دلان لاہور میں جینے کی جو اُمنگ ہے اور آج کا دن جی بھر کے جیو لائف سٹائل، لاہور والوں کی یہ ادا مجھے اچھی لگتی ہے۔

؏ اس شہر میں جینے کی ادا سیکھ رہی ہوں

س: اتنا عرصہ برف زاروں میں گزارنے کے بعد یہاں لاہور میں زندگی کیسی لگ رہی ہے۔

ج: بہت اچھی اور مختلف۔ جیسے ابھی بقر عید، رمضان اور عید الفطر گزری ہے میں نے بہت انجوائے کیا۔ خوبصورت پہناوے، مزے مزے کے کھانے اور بھرے پرے خاندان۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

ہمارا کلچر اور روایات آنے والے زمانے اور فیشن کے ساتھ مل کر حسین تر ہوتا جا رہا ہے اور یہ نئی نسل کے لیے بہت Appealing ہے۔

ہاں! اپنی ادبی پہچان کے حوالے سے کچھ مایوسی بھی ہوئی۔ ایک تقریب میں گئی تو کچھ نئے ادیب اور شاعر میرے نام سے واقف نہ تھے۔ اُن کا کوئی قصور تو نہیں مگر مجھے Feel ہوا اور واصف علی واصف کا یہ شعر یاد آ گیا:

یہ لوگ پوچھتے ہیں میرا نام کس لیے
تیری گلی میں آ کے عجب مخمصے میں ہوں

کیوں کہ میں تو اپنے تئیں نیویارک میں چھبیس (۲۶) سالہ قیام کے دوران ادب، شاعری، میوزک اور پاکستان کی شناخت کے محاذ پر ڈٹی رہی۔ لگن اور جذبے سے کام کیا۔ نام و نمود کی پروا کیے بغیر۔ میں سمجھتی ہوں کہ پاکستانی دنیا میں جہاں بھی ہیں، وہ پاکستان کے سفیر ہیں۔

س: شاعری آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ج: عامر! شاعری تو میرے نزدیک آسمانی تحفہ ہے اور خاص کر جب کوئی عورت شعر کہتی ہے تو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے سے تعلق رکھتی ہو وہ عورت کی بے بسی اور مجبوری کو زبان دیتی ہے۔ عورت کے پاس "Expression" آ جائے یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔

س: کیا آپ پاکستان میں عورت کے نام سے مطمئن ہیں؟

ج: پاکستان میں اب بچیاں پڑھ لکھ رہی ہیں۔ پروفیشنل بن رہی ہیں۔ فیشن ڈیزائنر ہیں، میڈیا میں کام کر رہی ہیں اور ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ مگر ادب میں خواتین کے حقوق کے لیے بات کرنا اب اتنا پسندیدہ نہیں رہا۔ وہ کہتے ہیں "Move Forward" یعنی اب عورتیں رونا دھونا بند کریں۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، سارہ شگفتہ بہت احتجاج ہو گیا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ ہماری سوسائٹی میں عورت کی محرومی اور غلامی کی جڑیں اتنی گہری ہیں اور اس کے سائے اتنے لمبے ہیں کہ فی الحال اس ''چیپٹر'' کو کلوز نہیں کیا جا سکتا۔

س: اکثر مرد شعراء یہ سمجھتے ہیں کہ شاعرات کو صنف نازک ہونے کا Advantage ملتا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج: دیکھیں صنف نازک ہونے کا Advantage تو ہوتا ہے۔ مگر شعر میں بھی جان ہونی چاہیے۔ آپ بھی تو اپنے مرد ہونے کا Advantage لیتے رہتے ہیں۔ اگر ہمیں شاعری میں تھوڑا سا فائدہ ہو گیا تو Jealous نہ ہوں۔

لطیف ساحل/لاہور

اُداس لوگوں کی تیمارداری کرتے تھے
یہ مشغلہ ہمیں بیمار کرنے والا تھا

میں لطیف ساحل کی شاعری کا پرانا مداح ہوں۔ میں نے جب بھی اس کی غزلوں اور نظموں کو پڑھا ہے مجھے ان میں ہمیشہ ایک تازگی اور نئے پن کا احساس ہوا ہے۔ عصری شاعری سے یہ شاعری مجھے ہمیشہ الگ اور منفرد لگی ہے۔ شروع شروع میں مجھے اُس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ لطیف ساحل کی شاعری میں وہ کون سی خاص بات ہے جو اسے دوسرے شعراء سے جدا کرتی ہے؟ وہ کیا چیز ہے جسے میں محسوس کرتا ہوں لیکن پہچان نہ سکا۔ ''خواب جزیرہ دل'' کا بغور مطالعہ کرنے سے آخر یہ گتھی سلجھ گئی۔ لطیف ساحل کے ہاں تجربے کا نیا پن تو ہے ہی، صورتِ حال کو محسوس کرنے کا انداز ہ بھی اس کا اپنا ہے۔ واقعات و واردات کا ردِعمل اس پر اس طرح مرتب نہیں ہوتا جس طرح عموماً دوسرے افراد پر ہوتا ہے۔ دراصل اس کی طبع نازک اور جمالیاتی حس نے اسے بہت زیادہ حساس بنا دیا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ یہ حساسیت اس کی شخصیت سے زیادہ اس کی شاعری کو متاثر کرتی ہے۔ (ڈاکٹر طارق عزیز)

میں سال کا آخری سورج ہوں
میں سب کے سامنے ڈوب چلا
کوئی کہتا ہے میں چل نہ سکا
کوئی کہتا ہے کیا خوب چلا
میں سب کے سامنے ڈوب چلا
اس رُخصت عالم میں مجھ کو
اک لمحہ رخصت مل نہ سکی
جس شب کو ڈھونڈنے نکلا تھا
اس شب کی چاہت مل نہ سکی
یہ سال کہاں اک سال کا تھا
یہ سال تو اک جنجال کا تھا
یہ زیست جو اک اک پل کی ہے
یہ اک اک پل سے بنتی ہے
سب اک اک پل میں جیتے ہیں
اور اک اک پل میں مرتے ہیں
یہ پل ہے میرے مرنے کا
میں سب کے سامنے ڈوب چلا
اے شام مجھے تو رُخصت کر
تو اپنی حد میں رہ لیکن
دروازے تک تو چھوڑ مجھے
وہ صبح جو کل کو آئے گی
اک نئی حقیقت لائے گی
تو اس کے لیے وہ تیرے لیے
اے شام تو اتنا جانتی ہے
اک صبح اُمید آثار میں ہے
اک در تیری دیوار میں ہے
اک صبح قیامت آنے تک
بس میرے لیے بس میرے لیے
یہ وقت ہی وقت قیامت ہے
اب آگے لمبی رُخصت ہے
اے شام جو شمعیں جلاؤ تم
اک وعدہ کرو ان شمعوں سے
جو سورج کل کو آئے یہاں
وہ آپ نہ پل پل جیتا ہو
وہ آپ نہ پل پل مرتا ہو
وہ پورے سال کا سورج ہو
اے شام مجھے تو رُخصت کر

بجائے آہ، جذبہ کھینچنا تھا
حبابِ دل میں دریا کھینچنا تھا
بقایا کرچیاں ہاتھوں میں تھیں اور
مجھے ایڑی سے شیشہ کھینچنا تھا
فلک آنکھوں تک آ کر رُک گیا ہے
مجھے دل تک ستارہ کھینچنا تھا
چلی آتی تھیں سب اک ساتھ مل کر
کہ لہروں نے کنارہ کھینچنا تھا
وہاں دنیا کی نفرت بجھ گئی ہے
جہاں جنت کا نقشہ کھینچنا تھا
سبھی پھینک آئے تھے جو بارِ ہستی
اُسی کو میں نے تنہا کھینچا تھا
فقط ہیں یہ تو ماتھے کی لکیریں
مصوّر نے تو چہرہ کھینچنا تھا
وہ آمادہ تھا تھوڑی سی رضا پر
مجھے اس کو زیادہ کھینچنا تھا
شرابِ وصل ہاتھ آئی نہ اپنے
کہ دونوں کو پیالہ کھینچنا تھا
برا دنیا مجھے ہی کہنے لگتی
برے کو میں نے ایسے کھینچنا تھا
جھٹک دیتا میں تارے آسماں کے
فلک کا میں نے کونا کھینچنا تھا

قاضی عطاء الرحمٰن / عارف والہ

کشش کچھ ایسی تھی مٹی کی باس میں ہم لوگ
قضا کا دام بچھا تھا مگر چلے آئے

قاضی عطاء الرحمٰن عارف والہ میں مقیم ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے محکمۂ تعلیم میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو گورنمنٹ امامیہ ڈگری کالج ساہیوال اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شعروادب کی تخلیق میں مصروف ہو گئے جس کے نتیجے میں بڑی جاندار اور توانا شاعری قارئین ادب کی نذر ہوئی۔ رباعیات لکھنا عام شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی لیکن اس تخلیقی عمل میں بھی قاضی عطاء الرحمٰن سرخرو دکھائی دیتے ہیں اور رباعیات پر مشتمل اُن کا مجموعہ کلام "خوشبو میں نہاتے رنگ" بھی منظر عام پر آیا جسے شعروادب سے تعلق رکھنے والے حلقوں نے بہت پذیرائی بخشی۔ انھوں نے غزل اور نظم میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور بہت عمدہ شاعری کو خوبصورت تخلیقی پیراہن سے آراستہ کیا۔ قاضی عطاء الرحمٰن کا تعلق ایک علمی اور ادبی خانوادے سے ہے اور بلاشبہ اُن کی شعری تربیت میں ان کے دادا جان کہنہ مشق شاعر قاضی عبدالرحمٰن مرحوم اور والد محترم ممتاز شاعر پروفیسر قاضی حبیب الرحمٰن کا خاصا عمل دخل دکھائی دیتا ہے۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" (علی رضا)

طلسم شب سے بہت بے خبر چلے آئے
یہ کیا کہ شام ڈھلے یار، گھر چلے آئے
کشش کچھ ایسی تھی مٹی کی باس میں، ہم لوگ
قضا کا دام بچھا تھا مگر چلے آئے
عجب ہے کیا جو ملے وہ ہمیں دوبارہ بھی!
ہم ایک خواب میں بار دگر چلے آئے
خرام کرتی ہواؤں پہ تیرتے نشے
چلا وہ شوخ جدھر کو، ادھر چلے آئے
کھلی جو آنکھ تو ویران تھا ہر اک منظر
ڈھلی جو رات تو کیا کیا نہ ڈر چلے آئے
وہ آہٹیں بھی کہیں کھو گئیں ہمیشہ میں
ہماری سمت، بھٹکتے کھنڈر چلے آئے
ہم اہل شوق کو صحرا کی وسعتوں میں عطاؔ
اسیر کرنے کو دیوار و در چلے آئے

جنوں کی راہ پہ کم کم سہی دل آنے لگا
یہ مرحلہ بھی چلو خیر سے ٹھکانے لگا
کسی نے پاؤں جو دہلیز خواب پر رکھا
ہر ایک منظر بے رنگ مسکرانے لگا
پھر ایک رنگ ہواؤں میں مسکرا اُٹھا
پھر ایک سحر سا قلب و نظر پہ چھانے لگا
یہ کون ہے جو مٹا کر ہر ایک نقش کہن
ہوا کی لو پہ ہے منظر نیا بنانے لگا
عذاب جاں، سفر آرزو ہوا کیا کیا
قدم قدم پہ کوئی مجھ کو آزمانے لگا
ملی جو فرصت یک دو نفس سحر سے مجھے
سکوت شام نئی داستاں سنانے لگا
نہ بے قراری جاں ہے نہ کچھ قرار عطاؔ
یہ کیسا زخم دیا ہے کسی ہوا نے لگا

بیاض دل پہ لکھے جو قلم، لکھا جائے
بخط رقص، طواف حرم لکھا جائے
اُتر رہی ہیں زمانوں کی وسعتیں دل میں
ازل سے سر ہے کسی در پہ خم لکھا جائے
ہماری شام بھی ہو روکش سحر، اے دل!
ہمارے جام کو بھی جام جم لکھا جائے
عجم میں رنگ عرب گوندھئے ذرا اور پھر
بساط ریگ عرب پر عجم لکھا جائے
کشید کیجیے مٹی سے اعتبار نمو
اور آگہی کے تسلسل کا غم لکھا جائے
چراغ سینچے لمحوں کی رایگانی پر
ہوائے شام تمنا کو سم لکھا جائے
لہو میں ناچتی وحشت کی اک گواہی پر
غزال شب کے مقدر میں رم لکھا جائے
صدائے کن فیکوں کے ہر ایک لہریے پر
عطاؔ حدوث میں ڈھلتا قدم لکھا جائے

لہو کا رقص جو دیوار میں نظر آیا
میں اپنے ہونے کے آثار میں نظر آیا
شعاع خاک سے حیرت کشید کرتا چراغ
رواق شام گہر کار میں نظر آیا
وہ سرد رات کا پچھلا پہر، وہ سناٹا
عجیب سایہ سا اشجار میں نظر آیا
کسی نگاہِ خوش اسلوب کے جھروکے سے
ہزار موسم گل، خار میں نظر آیا
ہتھیلیوں پہ بہاریں تھیں خیمہ زن کیا کیا
حنا کا رنگ، شب تار میں نظر آیا
یہ خال و خد یہ فسوں کاریٔ نشاط دوام
یہ کون موسم افکار میں نظر آیا
کھنڈر میں ناچتے سایوں کے آس پاس، عطاؔ
کوئی چراغ، کسی غار میں نظر آیا

پروفیسر اکرم ناصر/ساہیوال

مجھے اس قدر ہے یقیں کہ تجھ سا کوئی نہیں
میں کسی سے تیری مثال تک نہیں پوچھتا

ساہیوال میں مقیم پروفیسر محمد اکرم ناصر اردو اور پنجابی کے معروف شاعر ہیں۔ "اجمال" کے نام سے ان کی اردو شاعری کا اوّلین مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے 1980 میں گورنمنٹ کالج آف کامرس دیپال پور سے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا آغاز انسٹرکٹر کے طور پر کیا اور ملازمت کے سلسلہ میں پنجاب کے کئی اضلاع میں پروفیسر اور پرنسپل کے طور پر اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ بعد ازاں [31 اکتوبر 2012 کو گورنمنٹ کالج آف کامرس گوجرانوالہ کے پرنسپل کے طور پر اپنی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ محمد اکرم ناصر کی شاعری میں زندگی سے جڑے ہوئے مسائل کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔ وہ ایک خوب صورت انسان ہیں اور ہر کسی سے نہایت اپنائیت اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ ان کی شاعری میں رومانوی موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک محبِ وطن پاکستانی اور ایک اچھے تخلیق کار کی سوچیں بھی بھرپور انداز میں اپنی جلوہ گری دکھاتی ہیں۔ (علی رضا)

غلط بہت غلط ہوا ہے جو وہ کام کر چکا
کھلا یہ اس پہ جس گھڑی وہ قتلِ عام کر چکا
وہ مجھ سے لاتعلقی کے فیصلے تک آ گیا
میں اپنی ساری زندگی جب اس کے نام کر چکا
وہ سارا کھیل کھیلتا ہے مشغلے کے طور پر
اُسے اسے بھلا دیا جسے غلام کر چکا
ہے مجھ کو ان کی فکر جن کی عمر کی ہے صبح نو
ہے میرا کیا کہ میں تو زندگی کی شام کر چکا
یقین مان لو کہ جنگ ناگزیر ہو گئی
ہر ایک لشکری ہی تیغ بے نیام کر چکا

نہیں پوچھتا کئی سال تک نہیں پوچھتا
وہ کبھی تو وجہِ قتال تک نہیں پوچھتا
کبھی پہلے داؤ پہ ہی کسی کو دبوچ لے
جو کسی کو آخری چال تک نہیں پوچھتا
اسے کون لایا ہے پوچھ اوجِ کمال تک
وہ جو آج کل مرا حال تک نہیں پوچھتا
مجھے اس قدر ہے یقیں کہ تجھ سا کوئی نہیں
میں کسی سے تیری مثال تک نہیں پوچھتا
بڑا اعتماد ہے میرے بیٹے میں آج کل
مری رائے میرا خیال تک نہیں پوچھتا

یہ گھر کے ہیں بھیدی انہیں ماریں انہیں مسلیں
ہم کہتے نہیں تھے کہ یہی ناگ نہ ڈس لیں
اُگتی ہوئی دیکھی ہیں کبھی آج سے پہلے
بارود کی بارش میں کہیں امن کی فصلیں
کل روئیں گے ہم بھائی کے لاشے پہ مگر آج
قاتل کی خوشی ہے ذرا خوش ہوں ذرا ہنس لیں
بارود کا انبار بنا دی ہے یہ دنیا
اب جتنے دنوں اس پہ بسا جاتا ہے بس لیں
آلاتِ حرب وہ کیے ایجاد کہ واللہ
اب یاد کریں گی ہمیں انسان کی نسلیں

قریب آ کے کبھی دور جا کے دیکھتا ہے
وہ جیسے چاہتا ہے آزما کے دیکھتا ہے
کبھی وہ دیکھتا ہے سر سجا کے نیزے پر
کہ جیسے شاخ پہ غنچے کھلا کے دیکھتا ہے
کبھی وہ رکھتا ہے پیاسا کنارے آب کبھی
وہ جلتی ریت پہ زم زم اُگا کے دیکھتا ہے
کبھی وہ دیکھتا ہے دن کو دے کے سورج اور
کبھی وہ رات کو شمعیں بجھا کے دیکھتا ہے
وہ آسماں سے ذبیحہ اُتارتا ہے کبھی
کبھی زمین پہ مقتل سجا کے دیکھتا ہے

میں دیکھتا ہوں تو مجھ پر ہی ایسی قدغن کیوں
ہر ایک شخص ہی جلوے خدا کے دیکھتا ہے
کسی کو طور پہ دیتا ہے اک جھلک اور پھر
کسی کو عرش پہ اکرم بلا کے دیکھتا ہے

اُلجھنوں سے نکل جو بھی دل میں ہے اظہار کر دے
صاف اقرار ممکن نہیں ہے تو انکار کر دے
برف اتنی گراؤ کہ ٹھٹھری ہوئی ساری بستی
آگ میں کود جانے کی خواہش کا اظہار کر دے
فیصلے کی گھڑی ہے اسے سوچ ہی میں نہ کھو دے
جنگ میں جیت ہوتی ہے اس کی ہی جو وار کر دے
اس قدر خوف پھیلا ہوا بستیوں میں ہے اب تو
شام ہوتے ہی ہر اک مکیں در کو دیوار کر دے
چاہتا ہے اگر فیصلہ تیرے حق میں ہو اکرم
بات چیت ان سے کر، ساتھ لشکر بھی تیار کر دے

یہ مت پوچھو ہوا ہے کس طرح پر ہو گیا ہے
مبارک ہو تمہیں وہ معرکہ سر ہو گیا ہے
مقدر سے بھلا پھر کون لڑ سکتا ہے اکرم
بچھڑ جانا اگر اپنا مقدر ہو گیا ہے

شاہدہ لطیف /

بیت اللہ پر حاضری کروڑوں، اربوں مسلمانوں نے دی اور رہتی دنیا تک دیتے رہیں گے لیکن خلوصِ دل سے بیت اللہ پر دستک نہ جانے کتنے لوگوں نے دی ہوگی اور مراد پائی ہوگی۔ بیت اللہ پر دستک دنیا و مافیہا سے الگ درجہ و مقام رکھتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جانتا اور نیتیں پہچانتا ہے۔ اسی طرح وہ دستک میں پوشیدہ حاجات و احتیاجات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ ہمیں بھی دنیا کے سب سے عظیم گھر بیت اللہ پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اللہ کے محبوب رسولِ خدا آنحضرت ﷺ کے آستانہ پر حاضری، بزرگانِ دین اور انتہائی مقدس مقامات کا دیدار، ابھی تک یقین ہی نہیں آتا کہ یہ سب عز و شرف کیسے حاصل ہوا۔ بیت اللہ پر دستک، ہو جائے تو کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ بہر کیف اس دوران قلب و نظر اور دماغ و روح کی کیفیات نے جو مراحل طے کیے وہ ہم نے منظوم رُوداد کی صورت/ مجموعے کی شکل "بیت اللہ پر دستک" میں رقم کر دیے ہیں۔ یہ ہمارا تیسرا منظوم سفرنامہ ہے۔ اس سے پہلے پیرس کا منظوم سفرنامہ "برف کی شہزادی" اور برطانیہ کا منظوم سفرنامہ "اُف یہ برطانیہ" میدانِ ادب میں موجود ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ "بیت اللہ پر دستک" کو شرفِ قبول بخشے۔ (شاہدہ لطیف)

کن فیکون

ظلمتوں میں گم تھی ساری کائنات
ہر طرف تھی صرف رات
رات اور پُر ہول سناٹا، محیط شش جہات
ناشناسائی تھی نورِ حق سے اس ظلمات کو
آشنائی تھی اگر تو رات سے ہی رات کو
اک تحیر اور ہمہ گیر ایک استعجاب تھا
اور ہر سو گہری خاموشی میں گہرا اضطراب
دھڑکتی کن کی فضا
دھڑکا دلِ ظلمات بھی
تھکی وہ گہری رات بھی
اس کڑک میں روشنی کا دائرہ ظاہر ہوا
بارِ اوّل ظلمتوں نے روشنی کی دید کی
یعنی نورِ حق نے اب ظلمات کی تردید کی
آئی خالق کی صدا "کن"
ہو گیا "فیکون" یک
دوزخ و جنت، فرشتے، آسماں، کوہ و دمن پیدا ہوئے
نہر، دریا، پیڑ، پھل، پودے، نمو افزا ہوئے
خالقِ باری نے مٹی سے کیا تخلیق آدم کا وجود
اور فرشتوں کو دیا حکم سجود
سب فرشتوں نے کہا اللہ اکبر، سر بہ خم!
منکرِ تخلیقِ آدمؑ نے نہیں سجدہ کیا
پھر وہ مردودِ خلائق، راندۂ درگاہ تھا
صورتِ ابلیس نفرت کی علامت ہو گئی
بند اس پر خالقِ برحق کی جنت ہو گئی
پھر بھی وہ مردود اپنی ضد سے باز آیا نہیں
سانپ کی صورت بدل کر داخلِ جنت ہوا
حق نے جو ممنوع فرمایا تھا اس پھل کی طرف
حضرتِ آدمؑ و حوا کو بیک للچا دیا
اس قدر ترغیب دی، دونوں نے وہ پھل کھا لیا
اس طرح ابلیس نے انسان سے بدلہ لیا
حضرتِ آدمؑ بھی حوا کی رفاقت میں بہشتِ خاص سے
اس زمیں پر عرش سے بھیجے گئے
ساتھ ہی شیطان بھی نکلا دیارِ نور سے
حشر تک انساں کو بہکانے کی خاطر
راہِ حق سے اس کو بھٹکانے کی خاطر
اصل میں خالق کو نا منظور تھی توہینِ آدمؑ
اُس نے تو تعظیمِ آدمؑ پر سبھی
جن و ملک کو کر دیا تھا یک سجود
پھر زمیں پر کیسے وہ تکلیفِ آدمؑ دیکھتا
نسلِ آدم کی نمو انسانیت کے حق میں تھی
در حقیقت زندگی حقانیت کے حق میں تھی
اک سفر جب طے ہوا آدمؑ سے ابراہیمؑ تک
تب ہوا اک فیصلہ صادر خدا کی سمت سے
"اپنے اسماعیلؑ کو قربان کر میرے لیے"
اپنے رب کے حکم پر "لبیک" ابراہیمؑ کی
موجبِ رحمت ہوئی
ذبح دُنبہ ہو گیا صدقے میں اسماعیلؑ کے
چھا گئے ہر سُو اُجالے نور کی قندیل کے
پھر یہ صد اعزاز و رحمت حکم تھا اللہ کا
"میرا گھر تعمیر کر"
وادیٔ مکہ میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے
پتھروں کو توڑ کر ڈالی بنائے خانۂ حق الیقیں
پھر چنیں کعبہ کی دیواریں
کہا آقائے مارب کریم!
دیکھ اسماعیلؑ و ابراہیمؑ کی سعی و اطاعت
ہم نے تیرا گھر بنایا، گر قبول افتد زہے عز و شرف
تا ابد قائم رہے گا خانۂ کعبہ کا جلال
کیوں کہ ہے وحدانیت کی اک یہی روشن مثال

جانِ عالم/مانسہرہ

ہیں سبھی آگ بجھانے والے
آگ پھر کس نے لگائی بھائی

فغاں فغاں فغاں ابھی
بندھا نہیں سماں ابھی
ابھی تھکا نہیں ہوں میں
چڑھوں گا سیڑھیاں ابھی
اسی جگہ پہاڑ تھا
کھڑا ہوں میں جہاں ابھی
ہوں لامکاں میں دربدر
نہیں ملا مکاں ابھی
دبا ہوا ہوں راکھ میں
ہوا نہیں دھواں ابھی
وہ آئی سرپھری ہوا
بجیں گی کھڑکیاں ابھی
ابھی ہَوا میں ہو میاں!
ہے دُور آسماں ابھی
سمجھ بہار آ گئی
سمجھ گئی خزاں ابھی
وہ در کھلا، وہ آ گیا
ابھی کہاں، کہاں ابھی
میں خود سے مل نہیں سکا
کہ میں ہوں درمیاں ابھی

کچھ نہ دینا تُو صفائی بھائی
مر گیا بس تیرا بھائی بھائی
بجھ گیا شعلۂ پندارِ جنوں
آگ تھا ہو گیا چھائی بھائی
اس سے آگے کی کہانی مت پوچھ
اس سے آگے ہے جدائی بھائی
کوئی صورت نہیں سمجھوتے کی
ہے اصولوں کی لڑائی بھائی
ہیں سبھی آگ بجھانے والے
آگ پھر کس نے لگائی بھائی
قید میں آیا تو دُنیا چھوٹی
مل گئی مجھ کو رہائی بھائی
دشتِ افلاک سے وحشت نے مری
پائی بس آبلہ پائی بھائی
ہے دیا دست و گریبانِ سحر
رات دن کی ہے لڑائی بھائی
جھوٹ بولا نہیں جاتا مجھ سے
مجھ میں ہے بس یہ برائی بھائی

ایک نشے میں تھا، ہوا میں تھا
کچھ عجب سا مزا ہوا میں تھا
جیسے دروازہ توڑ ڈالے گی
اتنا غصہ بھرا ہوا میں تھا
تہہ بہ تہہ کالے سرمئی بادل
اک سمندر رکا ہوا میں تھا
وہم تھا خواب تھا خیال تھا سب
سلسلہ، رابطہ ہوا میں تھا

مہ و سال و ماضی و حال تُو
مرا زائچہ مری فال تُو
میں ہوائے کوچۂ عشق ہوں
مرا شرق و غرب و شمال تُو
میں کہ ایک نعرۂ بے خروش
جو لہو میں ڈالے دھمال، تُو
میں ہوں گوہرِ قلزمِ بیکراں!
مجھے تہہ سے اپنی اچھال تُو
میں زقندِ خوف و ہراس ہوں
مری مشکِ نافِ غزال تُو
تجھے کون سمجھے سوا ترے
کہ ہے آپ اپنی مثال تُو

ڈر

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا
مرے اجداد نے ورثے میں مجھ کو ڈر دیا ہے
گزرتے پل کو ڈر اور آنے والے کل کا ڈر
خدا کا ڈر.....
خدا کے ضابطوں کے چھوٹنے اور..
رابطوں کے ٹوٹنے کا ڈر
تو اتر نے مری پشتوں کی پشتوں سے
اُبلتے دودھ میں یہ ڈر ملایا ہے
یہ ڈر اب کس طرح جائے، یہ ڈر اب جا نہیں سکتا
مرے بیٹے نے کل مجھ کو جگا کر جب کہا پپا!
تم آنکھیں کھول کر سونا، مجھے ڈر لگ رہا ہے
تو میں اُس وقت بیٹے سے زیادہ ڈر گیا تھا

انیس احمد/ملک وال

سنو! میں اپنے ہی گھر سے نکلنے سے پہلے — میں خود کو اپنے ہی گھر سے نکال آیا ہوں

انیس احمد بنیادی طور پر ایک حساس انسان ہیں۔ یوں تو ہر تخلیق کار ایک خاص قسم کی حساسیت کا حامل ہوتا ہے لیکن انیس کے ہاں اس حساسیت نے جس وفور سے اپنا اظہار کیا ہے وہ چیزے دیگر ہے۔ اُن کی شاعری اصلاً مزاحمتی رویے کی شاعری ہے۔ وہ پسے ہوئے غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن اس پوژروائی کلچر کے پروردہ تخلیق کار کی طرح نہیں جو ہونٹوں میں قیمتی سگار دبائے ایلیگلیٹر سکن (Eligater Skin) کے پاپوش پہنے ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم کی خوشگوار اور خنک فضا میں قیمتی صوفوں پر بیٹھ کر غریب اور غریبوں کے مسائل پر باہم تبادلہ خیال کرتا ہے بلکہ انیس نے غربت کی دھوپ کو اپنے جسم اور روح پر ایک جیسا سہا ہے۔ اس کی تپش کو اندر تک محسوس کیا ہے اور پھر تخلیقی ردِعمل کے طور پر اسے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ہمارے ہاں مزاحمتی شاعری کی روایت اکثر محض حکومتوں اور اربابِ اقتدار کے ساتھ محاربے کی وقتی کیفیات تک محدود رہی ہے۔ جیسے ہی ریاست کی بساط پر اقتدار کے مہرے تبدیل ہوتے ہیں اُس کے حوالے سے کی جانے والی مزاحمتی شاعری دم توڑ جاتی ہے لیکن انیس احمد نے اشخاص کی بجائے رویوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس لیے اُمید جاتی ہے کہ ان کا کلام تادیر معتبر اور بامعنی رہے گا۔ عالمی سطح پر ہونے والی جغرافیائی تبدیلیاں اور ان تبدیلیوں کے لیے کی جانے والی مسلح سازشیں بھی انیس کا خاص موضوع ہیں۔ وہ عالمی جبر کو دورِ حاضر کا طاغوت سمجھتے ہیں اور فکری سطح پر اُس کے خلاف صف آرا ہیں۔ (صفدر رضا صفی)

مقامِ امتحاں تک آ گیا ہوں
چلو پیروں کی مٹی چھوڑتا ہوں
مسلمانوں کی بستی میں اکیلا
نہ جانے کیسے کافر ہو گیا ہوں
بہت کمزور سا ہوں استعارہ
ترے کہنے پہ مٹی میں ملا ہوں
مجھے سچا سمجھتی ہے یہ دنیا
بتاؤں کس طرح جھوٹا پڑا ہوں
فصیلِ شہر اب کیسے بچے گی
عدو سے اپنے جا کر مل گیا ہوں
بہت سے لوگ بہرے ہو گئے ہیں
میں بے آواز اکثر بولتا ہوں
میں خود کو کس طرح تبدیل کر لوں
تیرے ہاتوں کا لکھا فیصلہ ہوں
بھٹکنے کو وہ جب بھی چاہتے ہیں
قدم اپنے کہاں سنبھالتا ہوں
مرے بازو مرے پتوار ٹھہرے
سمندر پار کرنا چاہتا ہوں
پلک جھپکی تو سب کچھ خاک ہوگا
میں اس ڈر سے ہمیشہ جاگتا ہوں
کسی کو بھی طلب باقی نہیں ہے
مگر پھر بھی محبت بانٹتا ہوں
انیؔس احمد ہواؤں کے مقابل
بہت کمزور ہوں لیکن کھڑا ہوں

ہر پل اپنے آپ سے بھاگے رہتے ہیں
سو جائیں تو خواب میں جاگے رہتے ہیں
مشکل دور میں پیچھے رہنے والے لوگ
جب اعزاز ملے تو آگے رہتے ہیں
اپنے گردو پیش پہ کیا تنقید کروں
اُلجھے میری سوچ کے دھاگے رہتے ہیں
ان لوگوں کو بھیک بھی ملتی رہتی ہے
جن کے ہاتھ ہمیشہ آگے رہتے ہیں
دنیا داری میں ہم لوگ انیس احمد
اپنی دُنیا آپ تیاگے رہتے ہیں

پھولوں کی حسیں لاشوں سے گلدان سجا ہے
جب چاک ہوا میرا گریبان سجا ہے
انسان لگا دیتا ہے ہر چیز کی قیمت
شوکیس میں لیبل لگا انسان سجا ہے
کمروں پہ بھی بیٹوں نے قبضہ ہے جمایا
ماں باپ کو ڈالا ہے تو دالان سجا ہے
پاگل سے ہوئے جاتے ہیں صحرا میں بگولے
بپھرے ہوئے ذرّوں میں بھی طوفان سجا ہے
ہم اپنے ہی اعمال کی تشہیر ہیں کرتے
محراب بنے ماتھے پہ ایمان سجا ہے
ہر پھول کی پتی پہ پلٹ آیا ہے جوبن
تم لوٹ کے آ جاؤ کہ پھر لان سجا ہے

قمار خانۂ عالم میں ڈال آیا ہوں
میں کارِگل کو وہیں پر سنبھال آیا ہوں
سنو! میں اپنے ہی گھر سے نکلنے سے پہلے
میں خود کو اپنے ہی گھر سے نکال آیا ہوں
وجودِ شب کے ستاروں کو بیچنے کے لیے
وجودِ شب کے ستارے سنبھال آیا ہوں
تری نظر سے ابھی ایک صوت جاری ہے
میں بن کے تیر نظر کمال آیا ہوں
زمین گالے بنے گی تو دیکھا جائے گا
ابھی تو حشر کے لمحے کو ٹال آیا ہوں
فلک کو پاؤں کے نیچے لیا انیس احمد
زمیں کو پھر سے فضا میں اُچھال آیا ہوں

ڈاکٹر خالد جاوید جان/لاہور

ہم آگ پہ پھینکے گئے یا دار پہ لائے
ہر حال میں سچ کو لبِ اظہار پہ لائے

ڈاکٹر خالد جاوید جان کی شاعری ہمارے دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کا ایک جیتا جاگتا آئینہ ہے۔ مارشل لاء دور میں ان کی سیاسی جدوجہد نے ان کی شاعری کو عوامی امنگوں کی ترجمان بنا دیا ہے۔ انہوں نے اہم بین الاقوامی اشوز (Issues) تیسری دنیا اور خصوصاً ہمارے ہاں کے سیاسی جبر، معاشی ناانصافی اور مذہبی بلیک میلنگ کا پردہ جس جرأت سے چاک کیا ہے اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان کی نظم "میں باغی ہوں" ہمیشہ میری پسندیدہ نظم رہی ہے جس میں عوام کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس دورِ ستم میں ایسی انقلابی شاعری وقت کی اہم ضرورت ہے۔ (محترمہ بےنظیر بھٹو)

وہ شخص جو گزرا ہے ابھی پہلو بچا کر
ملتا تھا وہ پہلے مجھے سینے سے لگا کر

میرے ہی تعاقب میں ازل سے ہے مری پیاس
قطرے بھی لایا ہوں سمندر سے بچا کر

تقدیر کی بنیاد پہ ہے اُن سے تعلق
لے آئے ہیں ہاتھوں سے لکیروں کو چرا کر

یہ مئے غمِ جاناں کو بھلا دیتی ہے یارو
جب پیتا ہوں اس میں غمِ دنیا کو ملا کر

رشتے بھی ہیں اب کانچ کی گڑیوں کی طرح جان
ٹکڑے لیے پھرتا ہوں میں سینے سے لگا کر

ہم آگ میں پھینکے گئے یا دار پہ لائے
ہر حال میں سچ کو لبِ گفتار پہ لائے

اب مجھ سے طلب کرتے ہیں اقرار اطاعت
جو لوگ مجھے کوئے انکار پہ لائے

کاندھے پہ تو ہر شخص لیے پھرتا ہے سر کو
سردار وہی ہے کہ جو سر دار پہ لائے

حق گو کی نشانی ہے کہ وہ اپنی زباں کو
نیزے کی انی پر، کبھی تلوار پہ لائے

کچھ اس کی محبت کے تقاضے بھی عجب تھے
کچھ لوگ بھی دشنام مِرے یار پہ لائے

دوکانِ محبت سے نہ شکوہ، نہ شکایت
الزام تو سب لوگ خریدار پہ لائے

ہو زخم محبت سے شفایاب کبھی بھی
وہ وقت خدا مت، دلِ بیمار پہ لائے

ہر ایک خموشی نہیں اقرار محبت
وہ عشق ہی کیا جو کہ نہ اظہار پہ لائے

اب وقت نے ان کو بھی بنا ڈالا تماشا
جو لوگ مجھے کوچۂ بازار میں لائے

ہم اس کے لیے ردِ بلا کا ہوئے تعویذ
اب در پہ وہ لٹکائے کہ دیوار پہ لائے

اعتراف

تمہیں ملا تو مجھے یوں لگا تھا میری جاں
وہی ہو تم جسے میں دیکھتا تھا خوابوں میں
تمہارے حسن کی تعریف میں کروں کیا کیا
تمہاری آنکھ کی مستی کہاں شرابوں میں
میں سوچتا تھا تمہیں پا لیا تو جیون بھر
تمہارے بعد نظر میں کوئی نہیں ہوگا
کسی کے پیار میں یہ دل کبھی نہ دھڑکے گا
کہ تم سا بڑھ کے زمانے میں کیا حسیں ہوگا
اگرچہ اب بھی دل و جاں سے تم پہ مرتا ہوں
برا نہ ماننا میں اعتراف کرتا ہوں
تمہارے بعد بھی نظروں میں شعلہ بھڑکا ہے
تمہارے بعد بھی دل بے وفا یہ دھڑکا ہے

پت جھڑ ہو یا پھولوں کا اک ڈیرا ہو
جو بھی موسم ہو وہ جاناں تیرا ہو
میری آنکھیں بھی ہوں تیرے ساتھ طلوع
تیری زُلفوں میں ہی رین بسیرا ہو
رات ڈھلے تو سارے دکھ بھی ڈھل جائیں
کاش کسی دن ایسا ایک سویرا ہو
جیون کڑی دوپہر میں بادل آ جائے
ٹھنڈی ہوا ہو اور درخت گھنیرا ہو
اور جہاں میں کچھ بھی جان نہ ہو میرا
لیکن جس کو میں چاہوں وہ میرا ہو

علی افتخار جعفری/لاہور

ہم سے نالاں بھی وہ رہتے ہیں بچھڑتے بھی نہیں
ہم سفر اور کوئی راہ پکڑتے بھی نہیں

علی افتخار جعفری ایک شاعر کا دل لے کر اردو کی گلی میں آیا ہے۔ اوّل و آخر شاعر، نظم معریٰ اور نثری نظم کی بحث میں آنکھ کھولنے والے کو غزل نے اپنے اظہار کے لیے چن لیا ہے۔ علم اس کے پاس بہت ہے اور عشق سے بھی گریز نہیں لیکن وہ اس متاع کو ہتھیلی پر سجا کر بازار میں نہیں نکلا۔ اس نے اپنی واردات دروں اور اپنے عہد کے شعور کو ہنر کی کٹھالی میں رکھ کر ریاضت کی آنچ دی ہے۔ علی افتخار نے اپنے لحن کو پالیا ہے۔ اس پر روایت یا جدت کی تہمت نہیں دھری جاسکتی۔ یہ اکیسویں صدی کی اردو غزل ہے، بصیرت کی کٹھن وادیوں میں اپنی راہ تراشتی ٹھنڈے شفاف پانیوں کی ندی، اعتماد سے آگے بڑھتی ہوئی خالص شاعری۔ علی افتخار جعفری کے خواب مٹی میں مل گئے ہیں لیکن اس کے شعر کی رسائی بہت دور تک اور دیر تک ہوگی۔ علی افتخار جعفری کے زیر نظر مجموعہ میں ان کے اپنے بنائے ہوئے تجریدی خاکے بھی شامل ہیں جو اس کی مکمل اظہار کے لیے گہری خواہش پر دلیل ہیں۔ ان بظاہر بے پرواہی سے کھینچی لکیروں میں مجھے جمال اور توازن کے ساتھ اختیار کی جھلک بھی نظر آئی ہے۔ اختیار پہ اہل ثروت کا اجارہ تو نہیں۔ تخلیق کار کے اختیار کی حدیں تو زمان و مکان سے پرے وجودِ خالص تک پہنچتی ہیں۔ (وجاہت مسعود)

شورِ اوراق خزانی کوئی سنتا ہی نہیں
میں سناتا ہوں کہانی، کوئی سنتا ہی نہیں

میں نہیں ہوں، مری خوبو فقط اس خاک میں ہے
میں نہ باقی ہوں نہ فانی، کوئی سنتا ہی نہیں

گریہ کرتا ہوں کہ ویران ہوئے جاتے ہیں شہر
محوِ آزار رسانی کوئی سنتا ہی نہیں

کیسی آتش میں گھری خلق اماں ڈھونڈتی ہے
کون چلاتا ہے، ''پانی''، کوئی سنتا ہی نہیں

میں صدا کرتا ہوں ''اک بارِ جنوں پہ ہے
مار ڈالے گی گرانی'' کوئی سنتا ہی نہیں

مال و منال بھی رہا جامِ سفال بھی رہا
دستِ کرشمہ ساز میں اور ملال بھی رہا

عمر گزر گئی مگر رات بسر نہیں ہوئی
حالانکہ تجھ سا معجزہ شامل حال بھی رہا

یہ تو اُس ایک شخص کے جانے سے دم اُکھڑ گیا
بارِ نفس کا سلسلہ ورنہ بحال بھی رہا

خاک میں مل رہا تھا اور ڈھونڈ رہا تھا تجھ کو میں
مرحلہ شکست میں تیرا خیال بھی رہا

دکھ ہے کہ عمر بھر دراز، اہل عطا کے سامنے
دست گدا کی بھیڑ میں دست کمال بھی رہا

ہم سے نالاں بھی وہ رہتے ہیں بچھڑتے بھی نہیں
ہم سفر اور کوئی راہ پکڑتے بھی نہیں

رکھنے والے نے عجب ڈھنگ سے رکھا ہے ہمیں
سبز ہوتے بھی نہیں شاخ سے جھڑتے بھی نہیں

بے بسی میں خس و خاشاک سے بڑھ کر ہوئے ہم
باڑ آتی ہے تو بہہ جاتے ہیں اڑتے بھی نہیں

خاک کر دے گا ہمیں تیری زمینوں کا طلسم
شوقِ پرواز بھی ہے پیر اُکھڑتے بھی نہیں

کچھ ازل سے مرا قریہ بھی تھا ویرانہ سرشت
اور بسنے کے لیے شہر اُجڑتے بھی نہیں

اب فقط آپ کے دیوانوں پہ ہنستے ہیں عدو
اب وہ پسپا بھی نہیں ہوتے ہیں لڑتے بھی نہیں

کس کو ملنی ہے یہاں کس پہ فضیلت نہیں طے
سر کو رہنا ہے کہ وحشت کو سلامت، نہیں طے

چلنے لگتا ہوں تو پیروں سے لپٹتی ہے زمیں
پیش پا آن پڑی کیسی مسافت، نہیں طے

بکنے والے بھی تو اک ایک کا منہ تکتے ہیں
دام لگتے ہیں ابھی، شہر کی قسمت نہیں طے

ہاں تہ تیغ تو رکھا ہے گلو میں نے بھی
جیتنا ہے کہ اُٹھانی ہے ہزیمت، نہیں طے

آتش انگیز بھی ہے اور الم اُفتاد بھی دل
کشتِ باروت ہے یا قریۂ آفت نہیں طے

صبر اے سنگِ ستم، حلقہ رنداں میں فقیر
پیر رکھتا ہے ابھی، رنگِ ملامت نہیں طے

دستِ سفاک بھی کاسہ بھی عطا ہے مجھ کو
پالنے والے، مرے رزق کی صورت نہیں طے

خوں بہاتا ہے کبھی لطف بکف پھرتا ہے
اس کو اس شہر سے نفرت ہے کہ اُلفت نہیں طے

بر سر باد ہوا اپنا ٹھکانا سر راہ
کام آیا مرا آواز لگانا سر راہ

یہ جو مٹی تن باقی کی، لیے پھرتا ہوں
چھوڑ جاؤں گا کہیں یہ بھی خزانہ سر راہ

سلیم گورمانی/لاہور

شب بھر جو کھڑا رہتا ہوں یوں ٹکٹکی باندھے
کیا مجھ کو نظر آتا ہے مہتاب کے اندر

روبرو اُنؐ کے بے زبانی میری
کوئی دیکھے تو خوش بیانی میری
آنکھ تسبیح، اشک موتی ہیں
دیدنی ہے درود خوانی میری
وقفِ عشقِ رسولؐ ہو جائے
ورنہ کس کام کی جوانی میری
لب مہکتے ہیں پنکھڑی کی طرح
رنگ لائی ہے نعت خوانی میری
کیا کھلا مجھ میں اُن کی یاد کا پھول
ہو گئیں تتلیاں دوانی میری

جو شخص کہ ملنے کا نہیں خواب کے اندر
دل چاہے اسے عالمِ اسباب کے اندر
پھر یاد تیری دل میں اچانک چلی آئی
اک برق سی لہرا گئی اعصاب کے اندر
مایوس بھی اتنا نہ ہو اے دلِ ناداں
احباب بھی کچھ ہیں تیرے احباب کے اندر
شب بھر جو کھڑا رہتا ہوں یوں ٹکٹکی باندھے
کیا مجھ کو نظر آتا ہے مہتاب کے اندر
کرتا ہے نگہبانی یہاں آگ کی پانی
جلتے ہیں دیے دیدۂ پُر آب کے اندر

کسی زمین کسی آسمان میں رہنا ہے
کہیں بھی ہوں ہمیں قیدِ مکاں میں رہنا ہے
خلاء میں گھومتے رہنا ہے دائروں میں مدام
نظامِ گردشِ سیارگاں میں رہنا ہے
کبھی نہ پائے گی تکمیل داستانِ حیات
ہمارا قصہ یوں ہی درمیاں میں رہنا ہے
کوئی بھی اسم پڑھو یہ گہن نہ ٹوٹے گا
یقین کو ہالۂ وہم و گماں میں رہنا ہے
یہ چار دن ہیں بسر کر لو جس طرح ہو سلیم
ہمیشہ کے لیے کب کوئے جاں میں رہنا ہے

نہ حقیقت نہ فسانہ نہ فسوں ہے میرے دوست
یہ ہے دنیائے دنی، عالمِ دوں ہے میرے دوست
میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ ہوں حیراں اپنا!
تیرا رُخسار مجھے آئینہ گوں ہے میرے دوست
میری بے باکیٔ نظارہ سے ناراض نہ ہو
شوق سے میرے تیرا حسن فزوں ہے میرے دوست
دل سے ناحق نہ اُلجھ دل کا کوئی جرم نہیں
عشق بھی سلسلۂ کن فیکوں ہے میرے دوست
کوہ پیکر ہو عدو بھی لرز جاتا ہے
میری طاقت میرے اندر کا سکوں ہے میرے دوست

سخت سفید سفیدی، سخت سیاہ سیاہی خیر الٰہی
حوروں جیسی آنکھ اور اس پر نرم نگاہی خیر الٰہی
میرے چراغ بجھانے کو آئی تھی بن سوچے بن سمجھے
دیکھیں! دیکھیں! بھڑک اٹھی ہے آپ ہوا ہی خیر الٰہی
صاحبو! دو عالم کی ویرانی، ہیچ ہے اس کے آگے
اور ہی کچھ ہوئی ہے دیارِ دل کی تباہی خیر الٰہی
خوف و حزن کا یہ عالم ہے قدم قدم پہ کہتا ہوں سلیم
خیر الٰہی! خیر الٰہی! خیر الٰہی! خیر الٰہی!

دل سا معمورہ بیابان بھی ہو سکتا ہے
شہر کا شہر یوں ویران بھی ہو سکتا ہے
یہ جو حائل ہے میرے راستے میں اک سنگِ گراں
میری نیکی، میرا احسان بھی ہو سکتا ہے
نظر آتی ہے جو آنکھوں میں ذرا سی سرخی
کوئی اُٹھتا ہوا طوفان بھی ہو سکتا ہے
دم کشیدہ چلو اور گوش بر آواز رہو
آج کی شب کوئی اعلان بھی ہو سکتا ہے
بس یہی سوچ کے دو لخت نہیں تجھ کو کیا
تیرے اندر کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے
دیکھ کر پیار کی تلوار یہ دل سا کافر
ہاتھ پر تیرے مسلمان بھی ہو سکتا ہے
میرے دل میں جو کھٹکتا ہے کئی دن سے سلیم
اُس نظر کا کوئی پیکان بھی ہو سکتا ہے

اپنے رہنے کو تو اپنا ہی بدن کافی ہے
اور ہوس ہو تو جہاں سارے کا سارا کم ہے

رخسانہ سحر/اسلام آباد

جہاں شب کو اُجالے تھے وہاں اب دن میں ڈرتے ہیں عجب سی ہوگئی ہے صورت حالات گلیوں میں

سرکش، پرعزم تیور، گرمیٔ خلوص اور جذبہ وخیال کو لفظوں میں ڈھالنے کی فطری خواہش، رخسانہ سحر کی شاعری ان ہی تین خصوصیات سے مل کر بنی ہے۔ زیرنظر شعری مجموعہ ''تمہیں میں جیت لاؤں گی'' زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے لیکن اس جواں سال شاعرہ کے کلام میں '' کیسے دروازہ شب تم پہ کشادہ ہوگا'' جیسے اعلیٰ پائے کے مصرعے ملتے ہیں اور قافیہ پیمائی کی جگہ جا بجا تر وتازہ خیال اور عمدہ مضامین نظر آتے ہیں۔ سحر کی شاعری میں اسی کی قلبی واردات، جذبہ محبت اور تازگی فکر کے تانے بانے سے ہم عصر نسوانی شعور بھی نمودار ہوتا ہے اور ہم اس نئی عورت کا چہرہ دیکھتے ہیں جسے اپنی زندگی خود جینے کی آرزو ہے۔ خوش آمدید رخسانہ سحر شعروادب کے بے کنار میدان میں آثار بتا رہے ہیں کہ تمہارا سفر طویل اور بہت بارور ہوگا۔ (فہمیدہ ریاض)

سدا دل میں بساؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
زمانے کو دکھاؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
یہ میں نے سوچ رکھا ہے وفا کی جنگ میں آخر
میں خود کو ہار جاؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
بنا تیرے یہ گلشن کے نظارے مجھ کو ڈستے ہیں
میں تم بن رہ نہ پاؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
کئی خوشیاں مری دہلیز پر بیٹھی تو ہیں لیکن
میں ہر غم کو اُٹھاؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
سنا ہے دل کی بازی میں کبھی ہارے نہیں ہو تم
میں خود کو آزماؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی
ہو تم سورج محبت کے سحرؔ مجھ کو بھی کہتے ہیں
اندھیروں کو مٹاؤں گی تمہیں جیت لاؤں گی

وارفتگی میں اور بھی اچھا لگا مجھے
وہ جھوٹ کہہ رہا تھا جو سچا لگا مجھے
سورج کی روشنی نے نکھارا تھا میرا رُوپ
پانی میں اپنا عکس سنہرا لگا مجھے
اشکوں سے اُس کی پیاس بجھاتی رہی مگر
پیاسا یہ انتظار کا صحرا لگا مجھے
تب تک میں دلفریب نظارے میں گم رہی
جب تک گلاب سا ترا چہرا لگا مجھے

تکمیل ذات کی ہے اچانک ہوئی اُمید
اپنی طرح وہ شخص ادھورا لگا مجھے
میں نے بھی انتظار سحر رات بھر کیا
وہ سردیوں کا چاند بھی تنہا لگا مجھے

جو نظروں میں سما جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں
محبت بن کے چھا جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں
خوشی میں ساتھ دیتے ہیں زمانے کے سبھی ساتھی
غموں کو جو مٹا جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں
دسمبر چاندنی راتیں مری نیندیں اُڑاتی ہیں
جو ایسے میں سلا جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں
چھپا کر اشک آنکھوں میں ہنسی لے آئیں چہرے پر
جو دل کا بھید پا جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں
سحرؔ کا رنگ جن کے خال و خد سے آشکارا ہو
مقابل جب بھی آ جائیں وہ چہرے یاد رہتے ہیں

رات آئی تو چھٹ گئی ہے سحر
اِک دیے میں سمٹ گئی ہے سحر
آج شبنم سے منہ نہ دھویا تو
گردِ منظر سے اٹ گئی ہے سحرؔ

رات ہے مہر کی ہے پرچھائیں
اس موقف پہ ڈٹ گئی ہے سحر
ملگجی شام کو مبارک ہو
اُس کے رستے سے ہٹ گئی ہے سحر
دیکھتے رہ گئے ہیں شب زادے
پردۂ شب اُلٹ گئی ہے سحر

دبے پاؤں نکل آئی سنہری رات گلیوں میں
اندھیروں کی لگی ہے ہر قدم پر گھات گلیوں میں
جہاں شب کو اُجالے تھے، وہاں اب دن میں ڈرتے ہیں
عجب سی ہو گئی ہے صورتِ حالات گلیوں میں
چھائی تھی وفا دل میں مگر پھولوں کا موسم تھا
سو خوشبو کی طرح مہکی مری ہر بات گلیوں میں
اسی اُمید پر بالوں میں اُس کے آ گئی چاندی
کوئی شہزادہ لے کر آئے گا بارات گلیوں میں
ہنر کی قدر و قیمت گر گئی اس شہر میں اتنی
ہنرور مانگتے دیکھے گئے خیرات گلیوں میں
اندھیروں کا یہاں اک لشکرِ جرار ہے لیکن
سحرؔ پھر بھی اُجالوں کو نہ ہوگی مات گلیوں میں

عزت مآب/شیخوپورہ

وہ دیکھتا ہے منڈیروں کو چشم حیرت سے
اب اُس سے کیسے کہوں! میں دیے جلاتی ہوں

عزت مآب کو پہلی بار میں نے فیصل آباد کے عالمی مشاعرہ میں سنا۔ اس مشاعرے میں اُس نے اپنے خوبصورت اور منفرد کلام کے ذریعے بھرپور داد سمیٹی اور میں نے بھی اس سے قبل کسی نوجوان شاعرہ کی اتنی اچھی شاعری نہیں سنی تھی۔ سنجیدہ ادبی حلقوں میں جب بھی نوجوان شاعرات کی شاعری کے حوالے سے بات ہوئی تو اُس میں عزت مآب کا نام جینوئن اور منفرد شاعرہ کے طور پر لیا گیا۔ ہر جینوئن شاعر کی طرح اُس میں بھی بے نیازی کی خو ہے۔ ارژنگ میں میری ابتداء سے یہ خواہش رہی ہے کہ اچھے اور منفرد شعراء کا کلام شائع کروں۔ اس لیے عزت مآب سے میں نے متعدد بار درخواست کی اور اُس نے قدرے تاخیر سے اپنی غزلیات بھیجیں۔ میں عزت مآب کی شخصیت اور شاعری دونوں کا معترف ہوں۔ میرے خیال میں ہمارے موجودہ ادبی منظر نامے میں ایسی شاعرات کی ضرورت ہے۔ (حسن عباسی)

اے جذبِ نظر مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا
مت دیکھ اِدھر مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا
جا مانگ کسی اور سے باطل پہ گواہی
تکرار نہ کر مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا
جو کچھ تھا محبت تیری راہوں میں گنوایا
اب بارِ دگر مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا
کب تک میں دلِ زار تیرا ساتھ نبھاؤں
مرتا ہے تو مر! مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا
میں آپ شبِ ہجر کی بجھتی ہوئی لَو ہوں
بے نور سحر! مجھ سے تجھے کچھ نہ ملے گا

ہوائے دشتِ جنوں! میں دیے جلاتی ہوں
تجھے بھی آئے سکوں میں دیے جلاتی ہوں
بس ایک کام ہے کرتی ہوں شام ہوتے ہی
میں جانتی نہیں کیوں میں دیے جلاتی ہوں
وہ دیکھتا ہے منڈیروں کو چشم حیرت سے
اب اُس سے کیسے کہوں! میں دیے جلاتی ہوں
شبِ فراق! تیری تیرگی مٹانے کو
میں تیرے ساتھ چلوں؟ میں دیے جلاتی ہوں
ہوا مزاج کوئی میرے دل میں آیا ہے
میں کیسے بیٹھی رہوں! میں دیے جلاتی ہوں

رنگ پہلے سے نہ تھے اب کے رُخِ یار کے بھی
حوصلے پست رہے چشمِ گنہگار کے بھی
نہ ہوا یہ کہ وہ زنداں کی طرف سے گزرے
بھاگ اب تک نہ کھلے روزنِ دیوار کے بھی
کون دیتا ہے محبت کا علاقہ اپنا
خطہ سبز نہ چھوڑے گا کوئی ہار کے بھی
کچھ تو اس ہجر کی نسبت سے ملے ہیں مجھ کو
اور کچھ غم کہ لگا رکھے ہیں بے کار کے بھی
یہ جو عجلت ہے مجھے مار ہی دے گی عزت
اور یہ عجلت نہیں جائے گی مجھے مار کے بھی

خواب کو چھوڑ کے منظر کی طرف دیکھا ہے
میں نے کھڑکی میں سے امبر کی طرف دیکھا ہے
میرے اندر کی اُداسی ہی مجھے مار نہ دے
بس! اسی خوف سے باہر کی طرف دیکھا ہے
سرد مرطوب ہواؤں نے چھوا تو میں نے
دفعتاً مڑ کے سمندر کی طرف دیکھا ہے
پہلے دیکھا ہے بڑے پیار سے آئینے کو
پھر بہت رنج سے پتھر کی طرف دیکھا ہے
مجھ کو تحریر کی خامی نظر آئی عزت
میں نے اب حرفِ مکرر کی طرف دیکھا ہے

نہ اب وہ دل ہے نہ فرصت کہ آئینہ دیکھوں
اگر میں دیکھ بھی لوں آئینہ تو کیا دیکھوں؟
یہ رسم مجھ سے نباہی نہ جائے گی دنیا!
بھلا میں کیوں کسی پتھر کا راستہ دیکھوں
یہ مسئلے تو یونہی ساتھ ساتھ چلتے ہیں
کہیں ٹھہر کے کوئی خواب خوشنما دیکھوں
بہت سے لوگ مسافر سے بن کے آئے ہیں
میں کس کے ساتھ چلوں کس کے نقش پا دیکھوں؟
سمندروں پہ کوئی قرض ہے میرا عزت
سو مجھ کو حکم ہے پانی کا ذائقہ دیکھوں

ہے جس سے محبت اُسی صورت سے حسد ہے
حد ہے دلِ سفاک تیرے ظلم کی حد ہے
ہاں! ہے میرے لہجے میں میرے سچ کی گواہی
ہاں! میرے لیے میرا ہر اک لفظ سند ہے
اک خواب ہوں جو صبحِ ازل دیکھ رہی ہے
وہ خوابِ پریشاں کہ جو تا شامِ ابد ہے
مل سکتی ہوں آئینہ سے بے خوف و خطر میں
آخر مجھے حاصل کسی پتھر کی مدد ہے!
عزت مجھے اچھا ہے وہی سب سے زیادہ
اور اُس کے مقابل تو کوئی کچھ بھی ہو رد ہے!

ہجر کی خاک میرے خواب پہ آ کر نہ پڑے
اب میرے شیشہ دل پر کوئی پتھر نہ پڑے
ایک ہی نقش بنایا ہے بڑی مدت میں
بارشِ شوق کی اک چھینٹ بھی اس پہ نہ پڑے
اُس کی آواز پہ جانے کو تو جا سکتی ہوں
سوچتی ہو کہ کہیں پھر مجھے چکر نہ پڑے

شکیلہ ستارہ/واہ کینٹ

چڑھا ہوا تھا جو دریا وہ پار ہم نے کیا　　کہاں یہ سوہنی سے ہو پایا اس محبت میں

شکیلہ ستارہ منفرد لہجے کی نہایت توانا شاعرہ ہیں۔ وہ گزشتہ دو دہائیوں سے شعروادب سے منسلک ہیں۔ متعدد آل پاکستان مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔ بیت بازی کے حوالے سے اُن کے مرتب کردہ دو انتخاب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ''بیت بازی'' اور دوسرا ''بے مثال بیت بازی''۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا تارا'' زیر طبع ہے۔ اُن کی شاعری نہایت دل پذیر اور اثر انگیز ہے۔ وہ سادہ اور آسان لفظیات میں اپنی غزل کو بنتی ہیں جو قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ (ارژنگ)

جا رہا تھا تو منا لیتی اُسے
کاش میں واپس بلا لیتی اُسے
وہ اگر ملتا تو کاجل کی طرح
اپنی آنکھوں میں لگا لیتی اُسے
میں اگر اُس جیسی بن سکتی نہ تھی
اپنے جیسا ہی بنا لیتی اُسے
وہ کہیں تنہا نظر آیا نہیں
عین ممکن تھا چرا لیتی اُسے
اپنے آنگن کے در و دیوار پر
ان چراغوں سا سجا لیتی اُسے
وہ تو آنسو بن کے آیا ہی نہیں
اپنی پلکوں پر اُٹھا لیتی اُسے

زیست کا اعتبار بانٹتی ہوں
دُکھ کے ماروں میں پیار بانٹتی ہوں
چہرے افسردہ دیکھ سکتی نہیں
اُن میں ہر پل نکھار بانٹتی ہوں
خالی شاخوں پہ کاڑھتی ہوں پھول
میں خزاں میں بہار بانٹتی ہوں
وہ جو بیمار مر نہیں سکتے
اُن میں دل کا قرار بانٹتی ہوں

گردشیں ہیں چراغ منزل کا
راستوں میں غبار بانٹتی ہوں
میں ستارہ اُٹھا کے اپنی نظر
آئینوں میں خمار بانٹتی ہوں

یوں دل کو راکھ بدن کو غبار ہم نے کیا
تمہارے غم کو فقط اختیار ہم نے کیا
تمام شہر تجھی کو ستا رہا جاناں
یہی نہیں کہ ترا اعتبار ہم نے کیا
کہاں یہ سوہنی سے ہو پایا اس محبت میں
چڑھا ہوا تھا جو دریا وہ پار ہم نے کیا
تھا اس سے پہلے کہاں معترف ترا کوئی
اے شامِ ہجر تجھے باوقار ہم نے کیا
کہ خار لیتے رہے اور پھول دیتے رہے
تمام عمر یہی کاروبار ہم نے کیا

خدا سے ڈرتی ہوں پر ناخدا سے میں نہیں ڈرتی
دیا اپنا جلاتی ہوں، ہوا سے میں نہیں ڈرتی
میں ڈرتی ہوں زمانے سے کسی تازہ فسانے سے
پکارو تو چلی آؤں صبا سے میں نہیں ڈرتی
بہت سے سانحے دیکھے بہت سے حادثے گزرے
کسی محشر کسی اب کربلا سے میں نہیں ڈرتی
مجھے منظور ہے جو فیصلہ مجھ کو سناؤ تم
محبت جرم ہے تو پھر سزا سے میں نہیں ڈرتی
ستارہ اچھا لگتا ہے دیے پر ہاتھ رکھ دینا
اندھیروں میں رہی ہوں پر ضیا سے میں نہیں ڈرتی

بس ترا ہم نے اشارہ دیکھا
موج دیکھی نہ کنارہ دیکھا
زندگی بھر تمہیں سوچا ہم نے
عمر بھر خواب تمہارا دیکھا
دوستی کی تو بھروسے پر کی
نفع دیکھا نہ خسارہ دیکھا
جو زمانوں کے غموں سے چھوٹا
وہ گرفتار تمہارا دیکھا
آنکھ کھلتے ہی نظر آیا وہ
کیسا رنگیں یہ نظارہ دیکھا
جب بھی مشکل کوئی آڑے آئی
تیری بانہوں کا سہارا دیکھا
شمع کی طرح جلے صبح تلک
حوصلہ کس نے ہمارا دیکھا
جانے تعبیر ستارہ کیا ہو
میں نے ٹوٹا ہوا تارا دیکھا ہے

میجر (ر) خالد نصر راجہ

تجھ سے ترے خیال سے فرصت نہ مل سکے
یوں زندگی کے درد کا درماں کروں گا میں

۸ فروری ۱۹۵۰ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ بی اے کرنے کے بعد فوج کے شعبہ "توپ خانہ" میں دشمن پر گولے برساتے رہے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد لاہور میں Settel ہو گئے اور فوج سے Early Retirement لے کر علامہ اقبال یونیورسٹی میں ایم بی اے کے Students کو لیکچر دے رہے ہیں۔ مختلف اداروں میں بطور Head of Department اور پرنسپل کے فرائض انجام دیے۔ شاعری کا شوق رکھتے ہیں اور مشاعرہ میں شامل ہوتے ہیں۔

محفل میں آنسوؤں سے چراغاں کروں گا میں
یوں اہتمامِ جشنِ بہاراں کروں گا میں
اس کو دل و نگاہ میں مہماں کروں گا میں
آرائشِ خیال کا ساماں کروں گا میں
اب مندمل ہوا ہے میرے دل کا داغ داغ
پھر دعوتِ نگاہِ حسیناں کروں گا میں
گو جانتا ہوں وہ بڑے پیماں شکن بھی ہیں
پھر اُن سے نئے سرے سے ہی پیماں کروں گا میں
اب مل چکا ہے میری نگاہوں کو حوصلہ
اب انتظامِ شہرِ نگاراں کروں گا میں
آنے لگا ہے اشکوں میں میرے جگر کا خون
دامن کو اپنے رشکِ گلستاں کروں گا میں
پھر زندگی ہے راہِ حوادث میں گامزن
قلزم کی موج موج کو طوفاں کروں گا میں
تجھ سے تیرے خیال سے فرصت نہ مل سکے
یوں زندگی کے درد کا درماں کروں گا میں
دل میں چھپا کے اپنی تمنا کی روشنی
خالدؔ خیالِ حلقۂ یاراں کروں گا میں

تم دل میں تمنا کو یوں بیدار نہ کرتے
دل نہ لگانا تھا تو پھر پیار نہ کرتے
تم آتے تو اک چاند اُتر تا میرے گھر میں
تم ہوتے تو باتیں در و دیوار نہ کرتے
آئے ہو تو کچھ دیر میرے پاس رہو تم
جانا تھا تو جذبات کو بیدار نہ کرتے
ٹوٹے ہوئے دل کو بھی ذرا رکھتے نظر میں
بہتر تھا یہی تم ابھی انکار نہ کرتے
انجامِ محبت ہمیں معلوم جو ہوتا
ہم خود کو محبت کا طلبگار نہ کرتے
زنداں میں تیرے چاہنے والے ہی نہ ہوتے
سودا سرِ بازار خریدار نہ کرتے
یاروں نے ہی دشمن کو میرے مات کیا
دشمن نے جو کرنا تھا میرے یار نہ کرتے
آزاد منش تھا، اُسے آزاد ہی رکھتے
خالدؔ کو محبت میں گرفتار نہ کرتے

جس نے سفر کیا نہیں، رہبر نہ بن سکا
کوشش سے کوئی شخص، سخنور نہ بن سکا
بکھرا جو ایک بار وہ کیسے بنے گلاب
اُجڑا جو ایک بار تو پھر گھر نہ بن سکا
اُترا کبھی جو بحر میں، اس کو ملی مراد
ساحل پہ جو رہا، وہ شناور نہ بن سکا
اک بار وہ ملے، مرے اندر اتر گئے
پھر نقش کوئی بھی مرے دل پر نہ بن سکا
جوہر اگر نہ ہو تو نہیں کوئی کچھ یہاں
ہر سنگ اپنی ذات میں گوہر نہ بن سکا
محفل میں ایک بار وہ بیٹھے تھے روبرو
آنکھوں میں پھر کبھی وہ منظر نہ بن سکا
خالدؔ محل سبھی نے بنائے تو ہیں مگر
ہم سے تو ایک خانہ بے در نہ بن سکا

برہم اگر ہو گیا وہ ایک بات میں
کچھ بے رُخی کا رنگ بھی تھا التفات میں
سیدھی سی ایک بات ہے کہ ہم کو تو پیار ہے
اُلجھاؤ یوں نہ ڈالیے سیدھی سے بات میں
مانے نہ مانے کوئی عقیدے کی بات ہے
تجھ سا حسین کوئی نہیں کائنات میں
آزادیوں کے ساتھ ہی من مانیاں بھی ہیں
کہنے کو ہیں پڑے ہوئے قیدِ حیات میں
سنتے ہیں اپنی بات کو سب بے دلی کے ساتھ
شامل مبالغہ نہ ہو گر واقعات میں
تم جا چکے ہو پر تمہیں پھر بھی نہیں خبر
مرجھا گئی ہے زندگی بس ایک رات میں
دل جیتنے کی بات بھی خالدؔ درست ہے
لیکن مزا ہی اور ہے اُلفت کی مات میں

عامر سہیل / بہاولنگر

نذرِ عطاء الحق قاسمی

تعمیر اُس بدن پہ تمنا ہے مختلف
خواہش کا اور خواب کا ملبہ ہے مختلف
پتھر کے اور لکڑی کے گھر ایک سے نہیں
آبادیوں میں خوف کا دھڑکا ہے مختلف
دامن بچا کے ملیے تو اپنائیت بہت
پوروں سے چھو کے دیکھیں تو دنیا ہے مختلف
اُترے تو کھال کھینچ کے لے جائے ساتھ میں
چمکے تو یہ فریب کا چولا ہے مختلف
شاید ملیں دوبارا کسی تختِ خواب پر
اب انتظامِ دید کا وعدہ ہے مختلف
کیسے کسی وجود نے اپنا تمام عکس
مخمل کی چادروں پہ اُتارا ہے مختلف
دل پر بجھے نہ آنکھوں سے محو کلام ہو
یہ سات آسمانوں کا پردا ہے مختلف
سارے یگوں کا نور جو مل کر نہ دھو سکے
اس بار تو ضمیر پہ دھبا ہے مختلف
جس کی خراش جسم کو دو نیم کر گئی
سچ سے دُھلا وہ کانچ کا ٹکڑا ہے مختلف
تیری طرف بڑھیں تو بھرے شہر روک لیں
پھر بھی ہمارا بھیڑ سے رستا ہے مختلف
عامر بس ایک بار اُسے اور دیکھ لوں
یعنی پلک پہ نیند کا قصہ ہے مختلف!

اک لائنر نے دنیا کو سکتے پہ رکھ دیا
اک شاعری نے حسن کو باندھا ہے مختلف
جو جوگیوں کو راہ بھلائے وہ سادگی
جس کو خدا نے چن کے بنایا ہے مختلف
جو تتلیوں کی نیند اُڑاتی ہے ایسی نیند
مرتے ہیں پھول جس پہ وہ نخرا ہے مختلف
رہتی ہے بادلوں کے محلے میں جس طرح
لائی ہے آسماں سے جو نقشہ ہے مختلف
جو ابروؤں سے گفتگو کرتا ہے دہر سے
وہ حسن جس کی چپ کا علاقہ ہے مختلف
سنتے ہیں رنگ اُڑتے دوپٹے کی جل ترنگ
سینے کی قوس، باتوں کا جھرنا ہے مختلف
وہ آپ کر رہا ہے حفاظت وجود کی
جس نے بدن کا سیپ تراشا ہے مختلف
حمد اور اے خدائے پری زاد، تیری حمد!
چلتا ہے جو زمینوں پہ شعلہ ہے مختلف
وہ حسنِ ہند، حسنِ جہاں، خود بے خبر
جادو کے اک چراغ کی بھاشا ہے مختلف
راتوں کو جس نے سحر زدہ کر دیا مری
جو گھر میں جگمگاتا ہے چہرا ہے مختلف
عامر لہو کی دھار پہ پچھتاوا باندھیے
اک لپ سٹک کی سرخی پہ شکوا ہے مختلف

میں رنج رنج روز سسکتا ہوں تجھ سے دور
یہ اشک اشک مجھ میں تماشا ہے مختلف
تجھ عاشقی میں عشق اکیلا غزل سرا
تجھ روشنی کا دل پہ کرشمہ ہے مختلف
یہ چائے کی پیالی، یہ تیرے پیازی ہونٹ
یہ خال و خد، یہ رُخ کا صحیفہ ہے مختلف
رخسار پھیر، ابرو کی جنبش کو تیز کر
تجھ کاسنی شراب کا نشہ ہے مختلف
ہرزہ سرا نہیں ہوں تری جان کی قسم
میں نے تجھے جہان سے دیکھا ہے مختلف
زخموں پہ ہاتھ رکھتا ہے معجز نما سے ہاتھ
لفظوں کے اک رسول کا شہرہ ہے مختلف
آنکھوں پہ باندھ لیتے ہیں تلووں کی دُھول کو
عشاق کا ''سلوک'' میں کعبہ ہے مختلف
میں نے نشیب تیری محبت سے بھر دیے
اور اُس پہ تیری سطر کا میلہ ہے مختلف
مجھ میں بھی لختِ ابر و ہوا کی ہمیشگی
وہ بھی بھرے جہان میں تنہا ہے مختلف
پہلو میں بہہ رہی ہے ندی کی مسافرت
بھرتا نہیں شمیز میں دریا ہے مختلف
وہ اسم اسم میں ہے وہ شب کے طلسم میں
عامر مرے لہو کا وظیفہ ہے مختلف

آنکھیں ہیں اور رنگِ تماشا ہے مختلف
تاب اور حسن تابِ زلیخا ہے مختلف
ہنسنے کا سلطنت میں سلیقہ ہے مختلف
دیوار و در کے رونے کا وقفہ ہے مختلف
اک درد نے نصیب کو ہانکا ہے مختلف
جو کفر توڑتا ہے وہ نغمہ ہے مختلف

اک جلد پہ جہان کا جادو چلا نہیں
اک لعل آئنے میں دمکتا ہے مختلف
میں نے کھنک سے پھول چنے ہیں سہاگ کے
اک راگنی کے ہونٹوں پہ غصہ ہے مختلف
مخمل کی ڈوریوں سے وہ سینہ کسا ہوا
جو پیر چومتا ہے وہ زینہ ہے مختلف
ہمجولیاں جلو میں ہیں اور ٹولیوں میں ہیں
اک باغ یاسمیں میں پرندہ ہے مختلف
گستاخ شہر میں مری معذور چوکڑی
اُنگلی پکڑ کے اس نے چلایا ہے مختلف
سانسوں میں سانس جیسے پروتی ہیں لڑ بین
آغاز دلبری کا جھروکا ہے مختلف
لندن میں اُس کے خواب پریشاں نہیں ہوئے
یورپ کی سردیوں کا ٹھوکا ہے مختلف
چلتا ہے وہ تو شہر کے فٹ پاتھ اُس کے یار
اور مملکت میں کوئی فرشتہ ہے مختلف
وہ جس کا دل یہود نہ مٹھی میں کر سکے
جو جس وطن میں بھی ہو سچا ہے مختلف
بدصورتی میں دنیا کی میرے قلم کا حسن
جو سلطنت میں چلتا ہے سکہ ہے مختلف

وہ داستان گو جسے قصوں میں ڈھال لیں
گردن کا حسن، جسم کی مالا ہے مختلف
آفس کے کام سے بھی جو رنگت نہ ماند ہو
گھر کو چلے تو اُس میں اُجالا ہے مختلف
وہ دکھ میں مبتلا ہو تو بادل چھلک پڑیں
ہنسنے لگے تو صحن میں ہالہ ہے مختلف

چھپے لبوں کی کانپتی آیت سے گفتگو
ان ہرنیوں میں ایک غزالہ ہے مختلف
تجھ کو غزل کیا ہے بڑی دیر بعد آج
یادوں کی رُت میں خود کو سنبھالا ہے مختلف
مصرعوں میں گوندھتا ہوں تری کائنات کو
اس ٹھیکری سے میرا پیالہ ہے مختلف
میں معتکف ہوں عشق کا احرام باندھ کر
پریوں کی سلطنت کا شوالا ہے مختلف
تم بھی سہیلیوں میں ہو اک اپسرا سمان
میرا بھی شاعروں میں حوالہ ہے مختلف
بجھتا ہے جسم اور اندھیرے کے وار سے
مجھ کو سنبھال، دشت کا بھالا ہے مختلف
کیا زخم دار ہونٹ ترا سامنا کریں
عامر مرے دکھوں کا ازالہ ہے مختلف

ہونٹوں کو مختصر کیا، وحشت نہیں کی
تیرے بدن نے اپنی حکایت نہیں کی
کمرے کو جگمگا دیا دستک دیے بغیر
تیری ہنسی نے مجھ سے اجازت نہیں کی
بستر میں تیری نیند نے سی دی تھی ایک رات
میں نے کسی سے تیری امانت نہیں کی
خود کو شریک کرنا بھی اک شرک تھا مجھے
میں نے تو خود سے بھی تیری رنگت نہیں کی
پر شور دن کو بھی نہیں سونپا ترا وجود
تنہائیوں سے بھی تری عادت نہیں کی
وہ حرف بھی سنے جو تری خامشی میں تھے
جب تیری گفتگو نے بلاغت نہیں کی
میں نے بھی جذب کر لیے سب رنگ عمر کے
تجھ آنکھ نے بھی مجھ سے شرارت نہیں کی
پستی میں، فاقہ مستی میں، وحشت پرست سن
میں نے کسی سے نشے کی حالت نہیں کی
جب حسن کے فراق میں چھنوا دیا گیا
چڑی کی بے بسی نے نجات نہیں کی
کمرے کی روشنی نے بھی سکتہ پہن لیا
دیوار و در نے بھی مری رحلت نہیں کی
سینے میں بھر کے بھی مری انگار چشمگی
اک ان چھوئے گداز نے شہوت نہیں کی
جو سوئیاں بدن میں تھیں اب تک بدن میں ہیں
جو حیرتی تھے ان سے بھی حیرت نہیں کی
رب غزال میری غزل میں کمال رکھ
اس حسن سا کہ جس نے خیانت نہیں کی
میرے لبوں کا حال بھی سن کر صلیب پر
وہ کفر تھا کسی نے شہادت نہیں کی
سرما کی مشعلیں تھیں مرے شعر جل اُٹھے
اندھوں کی مجلسوں میں تمازت نہیں کی
ریشم کی ڈور جان گلے پہ برہنہ حرف
سچ بھی اگر کہا تو علامت نہیں کی
نظموں میں ملک ملک کا آشوب اشک گیر
غزلوں میں اپنے دُکھ کی کہولت نہیں کی
میرے قلم کا زلزلہ عامر تھما نہیں
تا خلق یہ کہے کہ قیامت نہیں کی

پنجاب رنگ

کتب (ہندکو رنگ) ہزارہ رنگ

پے گئی پلے جندڑی مرنے جوگی
جس دے اتنے صدمے سہہ کے
دیہاڑے کڈے کون سکھلے
جس دیاں ٹوکاں چھونڈاں مارن
جس دے مینے ماس ادھیڑن
دل دی اندھیری بیٹھک اندر
کالے پکھرو نالو پھڑ کے
مڑ مڑ کنداں ٹکراں مارے
پراں بچو چھکڑ شونگڑ
چیخاں بچو بجلی کڑکے
اس دا چوگ ان روگ پرائے
اس دے دانے اتھرو ماڑھے
سارے روگ سمندروں ڈھونگے
سارے اتھرو غم دے کھارے
فون دی ساری رونق گھس کے
دل دے سارے شوق مکاوے
اس دی چوونڈ تماشے دسے
کدے چاوے کدے ہٹاوے
پے گئی چلے جندڑی مرنے جوگی
جس دے اتنے صدمے سہہ کے
چیلے ناج دا میلہ لکسی
مرے ہتھ اک پہ آ جُلسی
اس کو میں نشان بنڑاساں
اپنی قبر تے کتبہ لا ساں

آصف ثاقب

چھیتی اُس نوں توڑ پچایئے
چنگے کم وچ دیر نہ لایئے
فنکاراں دا مان ودھایئے
اونھاں اگے سیس نوایئے
ویہلے ویلے من پرچایئے
ٹپے، ماہیے، ڈھولے گایئے
جلوے ہون تے ویکھدے جایئے
اینویں کاہنوں دل ترسایئے
جیہڑیاں سدھراں مر کھپ گیئں
کیہہ اونھاں دا سوگ منایئے
جی کردا اے اس ویری نوں
اس دے وانگ اک دن تڑفایئے
رکھدے نیں تاثیر پنجابی
وِرلے وِرلے اُردو ماہیے
خیر بتھیری اکو ای در دِی
در در دی پھٹکار نہ کھایئے
کون گوانڈھی کیہہ کیہہ کر دا اے
ایڈی ڈونگی کھوج نہ لایئے
تپ جاندے نیں ایویں ای جیہڑے
کیوں اونہاں نوں ہور تپایئے
جتنے ہون جے دل لوکاں دے
"میں" دے "مار" نوں مار مکایئے
کوئی آس نہ رکھئے راشدؔ
مجھ اگے جد بین وجایئے
چکڑ کولوں لنگدیاں ہویاں
راشدؔ اپنا آپ بچایئے

محمد ممتاز راشد/ دوحہ، قطر

رب سچا تے سونہڑاں

لگی بدلاں دی جھڑی جہان اندر
مُکیں وسیا مینہ اجے رحمتاں دا
جد تائیں نہ مالک خیر پاوے
کنھوں دکھاے ساڈیاں زحمتاں دا
گلی واج نہ سنڑیں زمانے دے
کسے صدر وزیر سفیر نے وی
رب سچا سونہڑاں تاں سن دا اے
ہر بھلکے نمانڑیں فقیر دی وی
اوہ مالک تاں سب نال پیار کرے
دکھڑے سب دے سنڑیں وچار کرے
انہوں ودھ ودھ کے اوہ جی آ نکھے
جیہڑا ذکر اُس دا بار بار کرے
چھڈ کھیڑا کمیاں لوکاں دا
چل رب سونہڑیں دے گھر چلیے
اوتھے سب مراداں پوریاں نیں
خالی جایئے تے جھولیاں ودھ بھریے

آفتاب راجا

نگھے نگھے دین ہنگارے، نبوواں دے بوٹے
کلی جندڑی، پاسے چارے، نبوواں دے بوٹے
اوہدے باجھوں باگاں وچ ویرانی اے
اوہدے باجھوں پھُل کھلارے، نبوواں دے بوٹے
تینوں میری ایہہ بھری جوانی کیہ آکھے
ٹُکراں کر دے مینوں سارے، نبوواں دے بوٹے

پنجاب رنگ

اج تے میں کنڈیاں نوں جھپے پا بیٹھا
مینوں لگے، نین کوارے، نبوواں دے بوٹے
ساتھوں تے اک پھُل بھلایا جاندا نہیں
خورے کردے کنج گزارے، نبوواں دے بوٹے
دس کدوں بہاراں دے شاہ آون گے
مینوں پچھن تیرے بارے، نبوواں دے بوٹے!
ایہہ وی تیرے رنگ وچ رنگے جچدے نیں
ویکھ کے مینوں کرن اشارے، نبوواں دے بوٹے!
پھلّاں دے وچ ہجر دے لانبو لگے نیں
ٹاہنی ٹاہنی بلن انگارے، نبوواں دے بوٹے!
پتے پتے وچ اہدیاں پیڑاں جگیاں نیں
بھردے رہندے نت ڈسکارے، نبوواں دے بوٹے!
اوہناں وانگوں خشبوواں دے وچ رہندے نیں
سانوں لگن اپنے پیارے، نبوواں دے بوٹے
فر ساڈے وانگوں چپ دی بکل مار بہندے
ہسدے نیں بس دو دیہاڑے، نبوواں دے بوٹے
دو گھڑیاں گل زیب کولے بہہ جا، توں
ساڈے وانگوں ایہہ ونجارے، نبوواں دے بوٹے!

گل زیب عباسی/ ڈونگا بونگا

گل کوئی تے کرماں والی سوچن دے
کنج لنگھنی اے رات ایہہ کالی سوچن دے
پیلے پے گئے جذبے سب اُمیداں دے
کیوں رہندی اے اکھ چ لالی سوچن دے
سدھراں دے کیوں بوٹے سُکدے جاندے نیں
کیوں ہویا اے دشمن مالی سوچن دے؟
جھگی ریجھاں نال بنائی سی
کاہنوں اپنے ہتھیں بالی سوچن دے
قسمت دے لیکھے تے پورے ہوندے نیں
اوہنے ہونی کسراں ٹالی سوچن دے
خورے کیہڑی گلوں اوہنے چھڈیا اے
جس دے لئی میں جند سی گالی سوچن دے
اپنی بال کے سیکن دا ای فیدہ اے
اوہنے کیوں نہ اپنی بالی سوچن دے

عقیل شافی / لاہور

دل دی کلی اُجڑی اُجڑی اُتوں گھپ ہنیرا
نہ کوئی سانوں واجاں مارے نہ کوئی پاوے پھیرا
اسیں تے اُجڑے اُجڑ گئے نیں ساڈے رین بسیرے
شالا وسدا رہوے ہمیشہ ساڈے یار دا ڈیرا
سدھراں دی بربادی اُتے دھاڑاں مار کے رونہیں
کجھ وی ایتھے رہ نہیں جانا کیہہ تیرا کیہہ میرا
اینا ظلم کماؤ لوکو جنا سہہ وی سکو
وقت نے اک دن پالینا اے چارے پاسوں گھیرا
سنجیاں گلیاں دلدل رستے اُتوں لمیاں راتاں
ایسے آس تے ٹردا جاواں ہوسی کدے سویرا

خاور وحید/ بہاولنگر

ہاسیاں دے وچ ہانواں اندر
وسدا جاندا ساہنواں اندر
کیہڑا کملا گھر وچ بہندا
اڈیاں مست ہواواں اندر
دنیا اگے لگ کے نسدی
ہووے زور جے بانہواں اندر
"لے او یار حوالے رب دے"
رکھیں یاد دعانواں اندر
خاور تیرے شعر دی گھُو کر
سندا پیاں فغاواں اندر

خاور وحید/ بہاولنگر

ویلے دا چکر

اج ویلے دے سینے چڑھ کے
اسماناں نوں چھوہن والیا
اپنی گل توں چیتے رکھیں
ویلا کھوہ دیاں ٹنڈاں وانگوں
گھمدیاں گھمدیاں
تھلوں اُپر آ جاوے تے اُتے آ کے رُک نہیں جاندا
کھوہ دا پینڈا اِمک نہیں جاندا
تھوڑی دیر دے نشیاں مگروں
ویلا چکر کھا جاندا اے
اُوپروں تھلے آ جاندا اے

خاور وحید/ بہاولنگر

بُجھی اگ دے فیر انگارے جاگ پئے
میرے جنے خواب سی سارے جگ پئے
محلاں دے شہزادے سارے سوں گئے نیں
جھگیاں دے وچ راج دُلارے جاگ پئے

پنجاب رنگ

توں آیا تے رات سہانی ہو گئی اے
اساناں تے جن ستارے جاگ پے
رات پئی تے ساری وستی سوں گئی سی
رات گئی تے ویکھو سارے جاگ پے
اک سوہنی نے ماری چیک جگاون لئی
کنے ورہیاں بعد کنارے جاگ پے

صغیر تبسم/بہاولنگر

ساڈا کج دے ربا ننگ

ماںواں دے پُھوکو کدے
اتے ڈھڈاں اچ بھکھ دی جنگ
ساڈا کج دے ربا ننگ
تیری یاد مصلے آوندی
ساڈے متھے ہوئے لیکھ
تینوں گرجے اندر کویا
تینوں لبھیا وچ مسیت
تیرے اگے متھا ٹیکیا
اتے جا کھڑ کائے ٹل
ساڈی رب نال کاہدی جنگ
ساڈا کج دے ربا ننگ

رگ رگ وچ الجھا دسیا
ساڈے لوں لوں وچ فرید
بے شہر رگ اندر وسنا ایں
فیر سندا کیوں نہیں کوک
ساڈے اندر کاہدی ہوک
سانوں لٹیا پھوکے ہاسیاں
اے روح کیوں لائی سنگ
مینوں پانیاں اندر روڑھدے
اتے لاوے بھاویں اگ
ایس جگ توں ڈاڈھے تنگ
ساڈا کج دے ربا ننگ

مشتاق قمر/چشتیاں

دوہڑے

چنگا جن ہووے بھاویں یک ہووے، کردیندا اپڑا ابھارا
جداں منگے تے وقت زوال ہووے، اہدا امبر والے جن سہارا
تے بھوں دولتاں آلے کم نہیں اوندے، کم اوندا جن پیارا
بندے انجم ہلالی گھٹ ملدن، جہڑے دیندے گل تے پاہرا

....

دعا سجناں نال کریندا نہیں، توں تاں دشمناں وانگ نبھائی اے
چنگے سجناں سر دا تاج ہوندے، نہیں کیتی توں چنگیائی اے
تے پل پل دے تیرے خادم ہاسے، نہیں کیتی تیں بھلیائی اے
دھوکا دے کے انجم پریت دے وچ، بھوں وتی جن رسوائی اے

شعیب انجم/کوٹ مصرال

اج وستی دے میلے اندر
رمزاں گجھے پیار دیاں
ویہ ورھیاں دے او لے یاداں
چیدے جی ای مار دیاں
تے نے ہاسیاں اندر
چیکاں وچھڑے یار دیاں

اجمل خیال/بہاولنگر

اکھاں اندر نشہ سی ودھیا
ودھے کوئی جیویں ویل
چندے اندر ساہواں تھین
مکھ تے چڑھی تریل
رشتاں اُتے ٹرپئی خوشبو
بھن جیتے دی جیل
چناں اُتے ہل دے ماہی
ہو گئی بڑی کویل

اجمل خیال/بہاولنگر

انسائیکلو پیڈیا پاکستان میں اوّل اوّل

زاہد حسین انجم

پاکستان میں شائع ہونے والا اپنی نوعیت کا پہلا انسائیکلو پیڈیا جس میں پاکستان کی ثقافتی، سیاسی، جغرافیائی اور دیگر بے شمار شعبوں میں سب سے پہلے وجود میں آنے والی اشیاء کو مستند انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قینچی

عبدالرشید/ننکانہ صاحب

لوکی اوہنوں خاں صاحب دے ناں نال جان دے سن بڑا کھلا ڈھلا بندہ ہس مکھ پیار کرن والا۔ اللہ تعالٰی نیں نوازیا وی بہت سی اوہنوں پیسے دھیلے دا تے کوئی انت ای نئیں سی آپ بنک دا وڈھا افسری پر نکے ملازماں نال بہت پیار کردا سی اک نکے ملازم نوں تاں سدا ای نال رکھدا اینج لگدا جیویں ایہہ ملازم نئیں اس دا اپنا ای کوئی بندہ اے۔ ہر گل تے اوہدے نال مشورہ کردا کرے یاں نہ اوہدی صلاح لیندا پر ملازم تے ملازم ای ہندا اے۔ شہر دے نال اوہدی دس مربعے بھوئیں وی سی جنہوں جے مریاں نال ویچ دا تاں ست نسلاں توں وی نہ مکدی۔ پر اوہنوں بھوئیں نال پیار سی تے اوتھے اوہنے کینواں دا باغ لوایا ہویا سی۔ فصل اینج ہندی جیویں رب بہت ای راضی اے۔ ہندا وی کیویں نہ جے اوہ رب دا دتا اوہ وی لوکاں لئی خرچ کر چھڈ دا سی کتے مسیت بن دی ہوندی تاں اوس جا اپڑنا کدی کسے مدرسے وچ جا گڈی وا ڑنی تے مدرسے دے بچیاں لئی کجھ نہ کجھ سامان نال لے جانا تے ونڈ آنا اک دن جٹ اوہدے نال سی! جٹ اوہدا نکا ملازم تے اوس گڈی اک محلے وچ جا کھڑی کیتی۔ اجے اوہ گڈی وچ بیٹھے ہوئے سن تے محلے دے کجھ بندے آ گئے۔ سلام کیتا تے آکھیا خاں جی تہاڈی اڈیک سی جنج آئی بیٹھی اے۔ خاں اپنی گڈی چوں لتھا تے ویاہ والے گھر پہنچا۔ آکھن لگا لا ہڑیا ایس کڑیاں کڑیاں نیں ویندے انیاں دا کیہ اے ایہہ تے بندہ آپ وی بنالیندا اے۔ ایہہ پھڑ 2 لکھ روپیہ کوئی کم کار کرلویں تے گھر نوں خش رکھیں۔ میں ایس بچی دا پیو آں ایہہ گل وی یاد رکھیں اچھا خاں جی اوس آکھیا۔ تے اوہ کجھ کھاہدیوں پیتیوں بناں اوتھوں ٹر گیا۔ جٹ دیکھ دیکھ کے حیران ہو رہیا سی دو لکھ روپیہ ایس اینج دتا اے جیویں کسے نوں دس روپے خیرات دئی دی اے۔ اوس جٹ دے گل تے بانہہ رکھی تے آکھیا ہاں پتر ٹھیک اے ناں اج ساڈوں اوس گھروں پانی نئیں سی پینا چاہی دا جے ایس اوتھے ٹھہر دے تاں گھر والیاں نوں اوناں چر ایہہ احساس ہندا جے ایس پیسے دین آئے آں تے ساڈے پیسے دین دا ثواب مک جاناسی جٹ پھٹیاں اکھاں نال ویکھی جا رہیا سی۔ خیرات دی آپ کیتی تے شرمندہ وی آپ ہویا۔ یا اللہ اینج دے لوک وی تیری دھرتی اتے وس دے نیں۔

اج عیدی تے اوس عید لئی سارے نکے ملازماں دے لیوے لتے اپنے کولوں لے کے دتے سن اوہدا وڈھا بھرا سیٹھ عرفاں خاں وی کراچی توں آیا ہویا سی سیٹھ نے اوہدے بچیاں نوں عیدی وچ ہزار ہزار دے نوٹ دتے تاں اوس دس دس روپے دتے تے آکھن لگا میں کوئی سیٹھ نئیں اک ملازم آں نکا جیہا بنک دا توں سیٹھ ایں تیرا میرا کیہ مقابلہ۔ ہس دے ہوئے اوہ سارے بھرا عید دی نماز پڑھن آئے ہوئے سن۔ جٹ اوہدے نیڑے رہندا سی ایس لئی اوس جٹ نال بہت محبت پیار سی۔ چھٹیاں مکیاں تاں اج فیر بیگ کھلیا خاں صاحب نیں اپنا بیگ اپنی میز دے سجے پاسے رکھیا ہندا سی۔

بنک نوں چھٹی ہوئی تے ملازم اک اک کر کے گھراں نوں پرت گئے۔ خاں صاحب نیں جٹ نوں ڈک لیا سی۔ آکھن لگا بچہ اج اک کم کر اپنا آکھ کے اوس اپنا بیگ چکیا تے میز تے رکھ کے کھولیا۔ تے اوہدے وچوں اک قینچی کڈھی اوس نوں آل دوالیوں ویکھیا تے جٹ دے لے ودھا دتی لے یار جٹ ایہنوں لے جا تے تیز کروا کے لیا۔ اک گل یاد رکھیں ایہنوں کوئی سٹ نہ لگے نہ ایہہ ٹٹے قینچی تیز کرن والے نوں آکھیں ایہدی دھار چنگی کر کے لا دے۔ میری گھر والی بڑی غصے والی اے تے ایہہ قینچی اوہدے خاص گہنیاں وچوں اک گہنا ایں۔ میرے نالوں ودھ کے اوہ ایہنوں پیار کردی اے۔ میری ماسی دی دھی اے ناں خورے ایس لئی۔ جٹ حیران ہندا ہویا ٹر پیا۔ یا اللہ ایہہ کیہ بندا اے عجیب عجیب گلاں کردا اے۔ ایہنوں کون افسر آکھے گا۔ کہوا ایہدی گل منے گا پر ایہہ وی تاں ہے جے کوئی ایہدے سامنے پر وی نئیں مار دا مارے ادب نال کھڑے رہندے نیں جد تک بہہ نہ جاوے کوئی اپنی کرسی تے نئیں بہندا۔ اوس بڑی احتیاط نال قینچی والے نوں دسیا تے قینچی تکھی کروا کے لے آیا۔ اینی دیر تائیں خاں صاحب بنک وچ ای بیٹھے رہے قینچی جٹ دے ہتھوں لے کے اوس اوہدیاں دھاراں ویکھیاں آل دوالیوں غور نال ویکھیا ٹوہیا تے آکھن لگا بہت خوب جٹ بڑا چنگا پتر ایں جیویں میرا جی کردا اس اوویں دا کم کروا کے لیایا ایں۔ فیر بہہ جا جٹ بہہ گیا تے خاں صاحب آکھیا پتر جان دا ایں ایہہ قینچی میں اینی کیویں سنبھالی ہوئی اے۔ ایہہ میری ماں دی نشانی ایں جد و اسیں یتیم ہو گئے ساں تاں ایس قینچی نال لیڑے کٹ کے میری ماں سلائی دا کم کردی سی تے اوہدی ایس محنت دا پھل اے جیہڑا اج میں ایس سیٹ تے بیٹھا واں۔ اسیں سارے بھرا ای ایس قینچی نوں بہت پیار کردے آں۔ ایہہ اک اک سال ساڈے تاں بھراواں کول رہندی اے تے اسیں ایہنوں عزت دیندے آں کیوں جے ایہدی وجہ نال ای اج ایس ایتھوں تیک اپڑے آں۔ ایہہ ساڈی ماں دی نشانی اے۔ اسیں ایہنوں چمدے اپنی موئی ماں دے ہتھ چم دے آں۔ جناں وچ ایہہ ساری حیاتی رہی اے۔ تے ایس ساہنوں منزل تے پہنچایا اے۔ اینا آکھ کے اوس قینچی نوں چمیا تے اپنے بیگ وچ رکھ لیا۔ تے آکھن لگا اک ہور گل دساں میرا وڈھا بھرا کراچی توں ایہہ قینچی لین آیا اے۔ کیوں جے ہن ایہہ اوہدے کول رہوے گی اگلے سال لئی۔ جٹ حیران ہو کے اوہدے منہ ول ویکھدا ای رہ گیا۔

تن دیپ تمنا/کینیڈا

تن دیپ دی کویتا دے جشن واسطے وارثن توں پہلاں جے مینوں سواگتی شبد کہن دا موقع دتا گیا تاں میرے موہنوں ایہو نکلے گا۔ جی آئیاں نوں، اج ایہہ کویتا پیدا ہوئی ہے، پیدا کیتی نہیں گئی...... اس کول جدوں وی شبد چل کے آوندے نے، تاں بس ایہو کہندے نے "دیکھو اسیں آ گئے ہاں، اپنیاں اکھاں وچ چاہت اتے متھاں وچ آتما بھر کے......! جدوں خاموش ہو کے بہہ جاندے نے تاں تن دیپ دیاں کویتاواں بیچ چیش کردا ہے نت آئے نئی دے سنتاپے ہوئے سنواد...... اتے...... کے بودھی برکھ دے پلٹن پہندے واردن...... اس نے اپنے سنواداں نوں اپنی ہی بھاشا وچ ان وا کر دیاں لیے وربیاں دی دھوئی سیری ہے، جس وچوں ہوا دے شور، کلکاریاں دے ہاسے، خوفناک راتاں دی موت دیواراں اندر جیوندے مار وقفل نوں اپنے شبداں رنا او ہلا دتا ہے، سلیقہ دار انداز نال...... (وارث درویش)

آشا اُتے نراشا

میری آشا اُتے نراشا
دال چینی دے رُکھ ورگی ہے
جس دے پتے جھڑ جھاندے
چھِل اُتر جاندے ہے......
پھیر رات و رات
کوئی جادوگر
اُہنوں سنہری چھلاں نال
بھر جاندا ہے......

ہَوَن کُنڈ تے اَگنی

ہَوَن کُنڈ وچ
اَگنی ہے
اَگنی دا گربھ
لاٹاں نے......
سوہیاں، نیلیاں
پیلیاں، بھوریاں
سنگتری لاٹاں......
چھل نہ ہون تاں
ایہہ موسم......
اپنے ہی خلا اندر غرق دے
اَوتر دے ہی رہ جاون......

ہنے، ہنے
متراں دی بین تے
ناگن وانگ ڈولدی
اک لاٹ......
یگ وچ نے
سرخ پھل اُتے
موہت ہوئی ہے......

حکم دے غلام

باہاں اُلار کے
میں ہس ہس آکھدی ہاں:
"......ایہہ سمندر......
ایہہ بارش......
ایہہ طوفان......
میرے حکم دے غلام نے......

جدوں وی چاہاں
اک چٹکی نال
اِنھاں نوں واج مار
میں انبر دے سینے توں
دھرتی دی روح تک
بھیج سکدی ہاں
توں پکھ پل......

خاموش کھڑا رہیا
پھیر مسکرایا
سکارف کھچ
میرا سر ڈھکیا
تے کہیا
"......توں اپنا بھیجیں گی تاں......
دھرتی دی روح توں
انبر دے سینے نوں
ٹھار چڑھ جاوے گا......"

میریاں نظماں دا ہر حرف

کتے اِکلّ ہنڈاوندی
شانت جھیل
بیچ کنارے بیٹھ
دوروں لنگھدے
سمندری جہازاں نوں ویکھیں......

تیرے بلھاں اُتے
ایہہ سوال
مُڑ کدے نہیں آوے گا
میریاں نظماں دا ہر حرف
سلونے پانی ورگا کیوں ہے......

سرِندر سوہل/امریکہ

ڈُھپ چ سڑدے نُوں جدوں اج چھاں مِلی مَیں رو پیا
بعد مُدّت دے سی مَینوں ماں مِلی مَیں رو پیا
اوہی گلوکڑی دی خوشبُو اوہی ترِپتا • دی جھلک
رون نُوں سی جد مُناسب تھاں مِلی مَیں رو پیا
پینگھ سندھُوی اُودھے والاں چہ نہ آئی نظر
اُس دِیاں باہاں چ چھن چھن ناں مِلی مَیں رو پیا
سی اودھے نیناں چ چِٹا جھوریاں دا موتیا
اُس دے مُکھ تے صدمیاں دی چھاں مِلی مَیں رو پیا
جو کدے مُسکان دے پھُلاں دی وادی وانگ سَن
ہُن اُنھاں بُلھاں تے جد چُپ چاں مِلی مَیں رو پیا
ہُن نہیں بچدا اسمجھ کے، ہس پیا کرماں تے مَیں
ڈُب رہے نُوں آسرے دی بانہہ مِلی مَیں رو پیا
بھوگدا بے گانگی پتّھر جہا ساں ہو گیا
اجنبی راہاں چ میری ماں مِلی مَیں رو پیا
ترِپتا گرو نانک دیو جی دی والدا

اِنھاں اندر وی سُفنے سُرخ سُتّے نے، جگا دینا
سماں مِلیا تاں بُجھیاں دیویاں نُوں اَگ چھُہا دینا
سیاہی جے نہیں مِلدی، میری رَت دا پتہ دینا
لِکھن نُوں نظم شاعر نُوں میرے دِل دا صفحہ دینا
مہک نُوں کٹّیا، دبیا، جلایا جا نہیں سکدا
میرے دُشمن نہیں ممکن میری ہستی مِٹا دینا
اسیں تاں جَل گئے پھُل وی ندی وِچ تار آوندے ہاں
تُہاڈے شہر ہی دستوُر ہے، زندہ جلا دینا
دبا کے اِس طرہاں رکھنا کے سر تے چھا ہی نہ سکّے
چراغاں توں سبق لے کے ہنیرے نُوں جگہ دینا

رات بن کے ہی سہی تُوں گھر مرے تاں آ کدی
لِکھ دِیاں مَیں نام تیرے عمر بھر دی روشنی
اُڈ گئے ہاسے دِلاں چوں نہ رہی اوہ دِل لگی
کی کرے شوکت • مراثی ہُن کسے نُوں مَشکری
میری چُپ دی پوٹلی اَج کھُل گئی اِنجھ چان چک
جد مِسز نُوں تیری فوٹو ڈائری چوں مِل گئی
حادثے جو چھڈ گئے تاریخ دے چہرے تے داغ
مِٹ نہیں سکنے اُوہ، بھانویں لکھ کراؤ سرجری
ہو گئے ساڈے مَناں دے لینز مَیلے اِس قدر
ہر جگہ تے لوڑ تاں ہی کیمرے دی پَے گئی
اِس چ سَو پھُلاں دے بُوٹے پھیر وی اِس دے نہیں
کرتیاں ورگی ہی قسمت رکھ دی ہے نرسری
کھِڑ دیاں ہی پتّی پتّی کر کے جھاڑے ایس نے
من چلی پت جھڑ نے پھُلاں دی چلائی پھُل جھڑی
اُس دی گُلّی دے تاں لکھ تیکر وی گہنے پَے گئے
ماپیاں نے نام جِس دا رکھّیا سی دَولتی
شوکت ڈھنواڑوی پنجابی داشاعر

مہندی دا رُکھ لٹ لٹ بلدا جد سُفنے وِچ دیکھے گا
برفاں دی نگری وِچ وی پردیسی دا دِل لُوسے گا
پَت جھڑے تاں سنگھنی چھاں وِچ گوڑھے گوڑھے داغ پئے
پَت لتھّن دے دُکھ نُوں رُکھ توں وَدھ کوئی کی سمجھے گا
جھلسے باراں تے ہُن وی ایہہ منظر جمیا ہونا ایں
بلدے پِنڈ توں مُنہ وٹ کے جد ساگر لنگھیا ہووے گا
ایس خبر دا بھیس سیاسی چہرے والا لگدا ہے
پتھراں دے مینہ چوں اوہ کچ دی چھتری لے کے گذرے گا
لنگھنی ہے سرکار تدے فانُوس دِنے ہی جگدے نیں
رات پئی تاں رستہ اَنھے بلباں توں لو منگے گا
اَگ توں بچن لئی سبھ نُوں جو چیتن کردا رہندا سی
اُس نُوں سار نہیں سی اُوہ خود سگرٹ کارن جھلسے گا
محل بنا کے برف دا اُس نے موم دے بُوہے لائے نیں
رات پئی تاں بال کے دِیوا کِس کھُونجے وِچ رکھے گا

مارُوتھل دے وانگ پیاسی اوس دی جاپی پُکار
لَے کے ہٹکورے پپیہا بولیا جد ترکسار
برکھ سُکے ہیٹھ ساوے پَت کھِلرے نے گواہ
رات نُوں چوری اِدھے تے روز آوندی ہے بہار
سی اجے بے داغ تاں دی اوس نُوں جلنا پَے
پھیر کی بن دا کفن دا جے اوہ ہُندا داغ دار
قینچیاں چلّی ہے پھر دی پَون گھر دے آس پاس
شوخی وِچ آ کے پرندے اِس طرہاں نہ پر کھلار
راستہ جیون دا رنگیلا مہکنا تے اُجاڑ
تُوں مِلی، کُجھ پھُل ملے، پھر دِن ملے نے سوگوار
تُوں جِتھاں دے آلھنے لُوہ کے بتائی سرد رات
بھر کے اَکھ نہ ہُن اوہ بے حرکت پئے پنچھی نہار
اِس چ نے سوچاں دے جالے تے نموشی دا سیلاب
اُنجھ ایہہ تن دا محل باہروں جاپدا ہے شاندار

ادبی خبریں/تقریبات

نامور شاعر احسان اللہ ثاقب خالقِ حقیقی سے جا ملے

لاہور میں مقیم نامور بزرگ شاعر اور صحافی احسان اللہ ثاقب گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ احسان اللہ ثاقب 7 دسمبر 1942ء کو پسرور ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور شاعر فاخر ہریانوی کے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے حاصل کی۔ تاریخ اور سیاسیات میں ایم اے کیا۔ اب وہ ... عرصہ سے لاہور میں مقیم تھے۔ اگر چہ وہ نصف صدی سے شعروادب سے وابستہ تھے۔ تاہم اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِغزل'' 2006 میں دوسرا ''محبت اور خوشبو'' 2010ء میں اور تیسرا برگِ شیریں 2010ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اوزان کے حوالے سے اُن کی کتب شہرِغزل اور کاروانِ غزل بہت اہم ہیں۔ اسی طرح ''شاعری کرنا سیکھیں'' 2013ء میں شائع ہوئی جو کہ شاعری کے فن سے متعلق منفرد اور اہم کتاب ہے۔ احسان اللہ ثاقب پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر حلقہ تخلیق ادب پاکستان کے جنرل سیکرٹری اور پاکستان رائٹرز فورم لاہور کے صدر تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ارژنگ کی پوری ٹیم لواحقین کے غم میں برابر کی شریک ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں تقریب

نامور کالم نویس، ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی کو حکومت پاکستان کی طرف سے ''ہلالِ امتیاز'' ملنے پر معروف شخصیت حسین شرازی نے اُن کے اعزاز میں جم خانہ کلب میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں لاہور کی معروف اور مایہ ناز ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ عطاء الحق قاسمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ عطاء الحق قاسمی نے شگفتہ انداز میں اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کیے۔ میزبان اور مہمانوں کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعہ پر قاسمی صاحب کو مبارک باد کے ساتھ ساتھ ادیبوں نے گلدستے بھی پیش کیے۔

معروف شاعر ریاض ندیم نیازی کے ساتھ ایک شام

معروف شاعر ریاض ندیم نیازی کے ساتھ ایک شام اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام الحمراء میں سبی بلوچستان سے آئے ہوئے معروف شاعر ریاض ندیم نیازی کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر سلیم گورمانی نے کی۔ مہمانِ خصوصی معروف شاعر، نقاد اور پروفیسر شفیق احمد خان تھے۔ علی رضا، حسن عباسی اور صاحب صدر نے ریاض ندیم نیازی کے فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ اُس کے بعد شعرائے کلام نے اپنا کلام پیش کیا۔ تقریب کے آخر میں ریاض ندیم نیازی سے اُن کا بہت سا کلام سنا گیا۔

بزمِ پرنم کا نعتیہ مشاعرہ

بزم پرنم کا ہفتہ وار نعتیہ مشاعرہ معروف شاعر سلیم گورمانی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مہمانِ خصوصی معروف شاعر، سفرنامہ نگار اور ماہنامہ ارژنگ کے ایڈیٹر حسن عباسی تھے۔ جبکہ مہمان اعزاز نعت اور غزل کے معروف شاعر اور پی ٹی وی کے پروڈیوسر علی رضا تھے۔ نقابت کے فرائض معروف شاعر پرنم الہ آبادی نے سرانجام دیے۔ اس محفل نعت میں کثیر تعداد میں شعرا نے شرکت کی۔ اس تقریب کی خاص بات عزیز میاں قوال کے بیٹے امیر خسرو کی شرکت تھی۔

پنجابی ادب سنگت کی ہفتہ وار تنقیدی نشست

پنجابی ادبی سنگت کی ہفتہ وار تنقیدی نشست اور محفل مشاعرہ پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ صدارت یو کے سے تشریف لائے ہوئے شاعر منصور آفاق نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی نامور شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی تھے۔ نقابت کے فرائض پنجابی ادبی سنگت کے چیئرمین سرفراز انور صفی نے ادا کیے۔ تنقیدی نشست میں آفتاب جاوید کے گیان اور افضل ساحر کے دوہوں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شعراء کی کثیر

تعداد نے شرکت اور پنجابی اور سرائیکی میں اپنا کلام پیش کیا۔

بزم پرنم کی نعتیہ، حمدیہ محفل

بزم پرنم کے زیر اہتمام ادبی، روحانی محفل میلاد اور نعتیہ مشاعرہ کی 46 ویں جمعرات نیو انارکلی نزد وارث نہاری ہاؤس پر منعقد ہوئی۔

خصوصی آمد: صدارت نعت گو شاعر جناب محمد یامین وارثی (کراچی) مہمان خصوصی جناب عشرت ظہیر صاحب (مترجم مفسر قرآن پاک) جناب سید اطہر علی نعت خواں۔ آر جے ٹی وی ریڈیو ایف ایم 105 کراچی۔ عرفان ہاشمی روزنامہ جناح پور نادر حسین صابری پروگرام آرگنائزر (کراچی)۔ سید جلال الدین قادری چشتی بندگی خادم الفقراء، سلیم چشتی (خادم آستانہ چشتیہ کراچی)۔ نظامت: اقبال پیامی صاحب کی تھی۔ دیگر شعراء کرام کے شعری نذرانہ عقیدت کے بعد محفل سماع میں امیر خسرو عزیز نے نعتیہ کلام پیش کیا۔ بزم پرنم کے سیکرٹری مقصود علی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادب سرائے ساہیوال کا نعتیہ مشاعرہ

ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام ۲۵۷ واں ماہانہ نعتیہ مشاعرہ صدر ادب سرائے پروفیسر سید رضا حسین زیدی کی اقامت گاہ پر زیر صدارت ونگ کمانڈر کرنل مظفر علی منعقد ہوا۔ مہمانِ خصوصی میاں عبدالستار اور مہمانِ اعزاز شیخ محمد فیاض تھے۔ تلاوت کا اعزاز پروفیسر زاہد ظہور کا مقدر ٹھہرا۔ پاکستان کے نامور نعت خوان احمد علی حاکم نے سید ریاض زیدی کی دو نعتیں نہایت پر اثر ترنم سے سنائیں۔ افضال حسین سہروردی اور علی رضا نے بھی نعت خوانی کا جادو جگایا۔ نقیب محفل حسرت بلال حسرت نے خوبصورت نقابت کا حق ادا کیا۔ نعتیہ مشاعرہ میں سید ریاض حسین زیدی، علی رضا، مرتضیٰ ساجد، احمد علی حاکم، غضنفر عباس سید، پروفیسر افتخار شفیع، شمشیر حسین زاہد، فاروق اظہر اور حسرت بلال حسرت نے اپنے نعتیہ کلام سے حاضرین کو بے حد محظوظ کیا۔ کثیر تعداد میں شرکاء محفل کی افطاری اور بعد از نماز افطار ڈنر کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

سلمیٰ ریاض کے اعزاز میں شعری نشست

گزشتہ دنوں کراچی کی معروف شاعرہ سلمیٰ ریاض گوجرہ تشریف لائیں تو گوجرہ کی فعال ادبی تنظیم روش نے پاکستان مسلم لیگ آفس میں اُن کے اعزاز میں 56 ویں شعری نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت سید اجمل شاہ بخاری نے کی۔ مہمانِ اعزاز راجہ محمد یوسف قمر تھے۔ نظامت کے فرائض غزالی نے نبھائے۔ دیگر شعراء کرام میں عبدالرحمٰن زاہد، عامر ریاض، علی اعجاز ساغر، جمیل عاجز، میاں رضوان افضل، عرفان خلیل رضا، تبسم بٹالوی، ظفر اقبال بادل، بشیر رانی، ماسٹر ناظر حسین ناظر، بشارت ساحر، صوفی اصغر علی، حافظ محمد جمیل اور انور ندیم شامل تھے۔ نشست میں خواتین کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور سلمیٰ ریاض کی شاعری کو سراہا۔ گوجرہ میں ہونے والی مذکورہ نشست بلاشبہ ایک یادگار نشست تھی جس میں سلمیٰ ریاض کو بھرپور انداز میں سنا گیا۔

بزم فکر ادب کے زیر اہتمام سالانہ محفل مشاعرہ

ساہیوال (سرگودھا) معروف ادبی تنظیم بزمِ فکر ادب کے زیر اہتمام سالانہ محفل مشاعرہ و تقریب تقسیم کتب کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ محفل مشاعرہ کی صدارت بزمِ فکر ادب کے بانی و صدر اسد اعوان نے کی۔ جبکہ تقریب تقسیم کتب کی صدارت ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ نے کی۔ سالانہ تقریب تقسیم کتب کی معاونت سے میں پانچ عدد خالد اردو نعت (خالد بک ڈپو لاہور) علم و عرفان پبلشرز لاہور، نستعلیق مطبوعات غزنی سٹریٹ لاہور، ماورا پبلشرز لاہور، خالد اقبال یاسر، فرحت عباس شاہ اور سعد اللہ شاہ درجنوں کتب تقسیم کی گئیں۔ تقریب کے مہمانانِ خصوصی مہر محمد عثمان راہنما مسلم لیگ نون، رانا عبدالجبار، اقبال ندیم اور بھائی ظفر تھے۔ جن شعراء نے اپنا کلام سنایا اُن میں اللہ دتہ عاصی، رضا جعفری، رفیق آزاد، ظہیر الدین ظہیر، کلیم اللہ روحیل، نصرت بلوچ، فاروق ماہر، احمد نشاط، اقبال ندیم، ڈاکٹر عنایت اللہ اور اسد اعوان شامل تھے۔ تقریب میں شہریوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

تبصرۂ کتب

بیت اللہ پر دستک/ شاعرہ: شاہدہ لطیف/ منظوم سفر نامہ/ قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز پرانی انارکلی، لاہور فون 37310944-042

اُردو میں سفر نامے کی روایت بہت مضبوط اور توانا ہے۔ نثر میں تو 2000 کے قریب سفر نامے شائع ہو چکے ہیں۔ البتہ منظوم سفر ناموں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والا منظوم سفر نامہ ''بیت اللہ پر دستک'' اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اسے معروف شاعرہ، ادیبہ، کالم نویس، سفر نامہ نگار اور ''اوورسیز انٹرنیشنل'' کی مدیرہ شاہدہ لطیف نے تخلیق کیا ہے۔ ادب میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ سو یہ سفر نامہ عاشقانِ رسولؐ اور اللہ کے عاجز بندوں کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں ہے۔ اُمید ہے قارئین اسے ضرور پڑھیں گے۔

منادی/ نظمیں/ شاعر: شاہین عباس/ صفحات: 160 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: کاغذی پیرہن، عظیم مینشن رائل پارک، لاہور 4649684-0321

شاہین عباس کا نام جدید اُردو نظم و غزل میں نہایت معتبر ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والا اُن کا نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں توجہ کا مرکز ہے۔ کیونکہ اس سے قبل وہ بطور غزل گو شاعر اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔ معروف نظم گو شاعر نصیر احمد ناصر اپنے فلیپ میں شاہین عباس کی نظم سے متعلق لکھتے ہیں: ''شاہین عباس کا نام آتے ہی اگرچہ ذہن میں ایک عمدہ غزل گو کا تصور اُبھرتا ہے لیکن گاہے گاہے اُن کی نظمیں بھی سامنے آتی رہیں جو نہ صرف اپنی جانب مائل بلکہ قائل بھی کرتی تھیں اور اب اس مجموعے تک آتے آتے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ ایک پختہ نظم گو کا روپ دھار چکے ہیں اور جملہ اوصاف نظم و غزل سے درجہ وار لیس ہو کر سامنے آئے ہیں۔

دستخطِ یار/ شعری مجموعہ/ شاعر: عامر سہیل/ مرتب: احمد علی کیف/ قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: ماورا بکس 60 دی مال روڈ، لاہور 36303390-042

معروف شاعر عامر سہیل کا نام شعری حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ منفرد اور جدید غزل و نظم گو کی حیثیت سے بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے

متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چند کو ادبی اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ نوجوان شاعر احمد علی کیف نے ان کے کلام سے انتخاب کر کے کتاب ''دستخطِ یار'' کے نام سے شائع کی ہے۔ اچھی شاعری کا ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

خود سے اجنبی/تراجم/مترجم: غضنفر عباس/صفحات: 216 / قیمت: 700 روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: دولت آباد پبلی کیشنز: V-237 ڈی ایچ اے فیز II، لاہور

عارف والا میں مقیم معروف شاعر غضنفر عباس کی کتاب ''خود سے اجنبی'' اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس میں شاعر نے انگریزی کی شاہکار نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس سے قبل غضنفر عباس کے دو شعری مجموعے ''دستک'' اور ''شب رائگاں'' شائع ہو چکے ہیں۔ جنہیں ادبی اور عوامی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ملی۔ زیر نظر شعری کاوش کو بھی خوب سراہا جا رہا ہے۔ کیونکہ منظوم ترجمہ کرنا زبان جاننے والوں کے لیے آسان ہے۔ مگر ایسا منظوم ترجمہ جو شعریت سے بھرپور ہو بہت مشکل ہے۔ غضنفر عباس کی کتاب ''خود سے اجنبی'' اس حوالے سے اتنی منفرد ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد شاعر کی کاوش کو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

تمہیں میں جیت لاؤں گی/شعری مجموعہ/شاعرہ: رخسانہ سحر/صفحات: 172 / قیمت: 280 روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: وحید پبلی کیشنز، بک اسٹریٹ 46 مزنگ روڈ، لاہور 0423-37323950

رخسانہ سحر معروف شاعرہ ہیں۔ ''تمہیں میں جیت لاؤں گی'' ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسے مکمل اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ رخسانہ کی شاعری سے متعلق فہمیدہ ریاض، شبنم شکیل، سید عارف اور دیگر بہت سے شعراء کی آراء شامل کتاب ہیں۔ شبنم شکیل لکھتی ہیں ''رخسانہ نے اپنے آپ کو دوہرانے سے حتی الوسع گریز کیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں اس سے تو بڑے بڑے شعراء بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یہاں میرا مطلب یہ نہیں کہ فنی لحاظ سے اب اس کی شاعری بہت پختہ ہوگئی۔ مگر اب اس کے اندازِ فکر میں ایک واضح تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔

نیلگوں/شعری مجموعہ/شاعر: شہاب صفدر/صفحات: 144 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد 2615359

شہاب صفدر منفرد لہجے کے نہایت خوبصورت اور دل پذیر شاعر ہیں۔ وہ گزشتہ تین دہائیوں سے غزل کی صنف میں اپنے فن کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اُن کی

نظم بھی اپنے منفرد اسلوب کے باعث نہایت اثر پذیر ہوتی ہے۔ ''نیلگوں'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے جو کہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ افتخار عارف اُن کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں ''اُردو غزل کی عظیم کلاسیکی روایت اور جدید طرزِ احساس کی آمیزش سے نئی نسل کے جن شعراء نے اپنے لیے ایک مقام حاصل کیا ہے شہاب صفدر اُن تخلیق کاروں میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔'' اُمید ہے یہ خوبصورت مجموعہ کلام قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

چاند میرا منتظر/ ناول/ مصنفہ: ارم زہرا/صفحات: 407 / قیمت: 500 /تبصرہ نگار: حسن عباسی

ناشر: دُعا پبلی کیشنز الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور 0423-7233585

ناول خاص کر خواتین کے لکھے ہوئے ناول ان دنوں کتب کی مارکیٹ میں سیل کے حوالے سے دیگر اصناف ادب کو مات دے گئے۔ سوآئے دن ملتے جلتے موضوعات اور ناموں سے ناولز شائع ہو رہے ہیں۔ مگر ارم زہرا کا ناول ''چاند میرا منتظر'' اس بھیڑ میں نہایت منفرد ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کی نثر ادبی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ موضوع اگرچہ پرانا ہے لیکن ارم زہرا نے اپنے انداز سے اس محبت کے موضوع کو بھی نیا کر دیا ہے۔ یہ ارم زہرا کا پہلا ناول ہے اور اتنا بھرپور ہے کہ اگر وہ کوئی اور ناول نہیں بھی لکھتیں تو اس ناول سے ہی اُن کی پہچان قائم رہے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ہماری دیگر مقبول ناول نگار خواتین کی طرح بہت سے ناول لکھیں گی جو نہ صرف اُن کی مقبولیت میں اضافہ کریں گے بلکہ ادب میں بھی ان کی نیک نامی کا باعث ہوں گے۔

عظمت کون و مکاں/ شاعر: محمد یامین/صفحات: 128 / قیمت: 120 روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: حضرت محمد ابراہیم حیدر شاہ اکادمی، کراچی

عظمت کون و مکاں جناب محمد یامین کا نعتیہ مجموعہ چھپ کر مارکیٹ میں آچکا ہے۔ محمد یامین نے عشق نبی میں ڈوب کر حمد اور نعتیں لکھ کر آنحضرت ﷺ سے اپنے والہانہ عشق کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ نعتوں میں نغمگی کی چاشنیت بھی ہے جو نعت خوانوں کو ترنم میں پڑھنے میں آسانی ہوگی۔ چھوٹی اور بڑی بحر دونوں میں یامین صاحب نے نعت گوئی میں نعت کی عظمت کا ہر طرح سے خیال رکھا ہے۔ اُمید ہے عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے گی۔

جو بھی تو ہے/ شاعر: رفیق کاشمیری/صفحات: 148 / قیمت: 250 /تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی

ناشر: ایسکا پبلشرز، اوکاڑا

ادبی دُنیا کے اردو پنجابی کے معروف شاعر رفیق کاشمیری کا ۱۳واں شعری مجموعہ ''جو بھی تو ہے'' اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چھپ کر منظر عام پر آیا

ہے۔رفیق کاشمیری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔چھوٹی اور بڑی بحر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔پہلے بارہ کے بارہ مجموعہ کلام ادبی حلقوں میں پسندیدگی کا درجہ پا چکے ہیں۔اُمید ہے یہ مجموعہ بھی سابقہ مجموعوں کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

چانن لبھدیاں راتاں/شاعر:شکیل امجد/صفحات:120 / قیمت:250 روپے/تبصرہ نگار:نازاوکاڑوی

ناشر:علم وعرفان پبلشرز،الحمد مارکیٹ اُردو بازار،لاہور

شکیل امجد ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے پروفیسر بھی ہیں۔گورنمنٹ کالج اوکاڑا میں اُردو پڑھا رہے ہیں۔''چانن لبھدیاں راتاں'' ان کا پہلا مجموعہ ہے۔اس مجموعہ پر ''سخن ورنجمی،عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی (گلوکار) اور رضا اللہ حیدر کی آراء بھی موجود ہیں۔اُمید کی جاسکتی ہے شکیل امجد کا یہ مجموعہ ادبی حلقہ میں ضرور پذیرائی حاصل کرے گا۔

چاند جب دھوپ میں نہاتا ہے/شاعر:حیدر علی ساحر/صفحات:112 / قیمت:200 /تبصرہ نگار:نازاوکاڑوی

ناشر: الیسکام پبلشرز،اوکاڑا

حال ہی میں چھپنے والا مجموعہ ''چاند جب دھوپ میں نہاتا ہے'' حیدر علی ساحر کی کاوش ہے۔غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے دلکش اور موضوعات سے بھرپور چاشنی لیے ادبی قارئین کے دلوں میں ضرور جگہ پائے گا۔حیدر علی ساحر کی شاعری پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔

بحر ہجر/شاعرہ:حجاب عباسی/صفحات:160 / قیمت:300 روپے/تبصرہ نگار:نازاوکاڑوی

ناشر: دُنیائے ادب کراچی،623-6th فلور ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک،کراچی

محترمہ حجاب عباسی کا دوسرا مجموعہ کلام تحیر ہجر پڑھنے کو ملا ہے۔اس سے قبل ان کا مجموعہ کلام تجدید ہجر بھی خاص و عام میں خاصا پسند کیا گیا۔زیر تبصرہ مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔پڑھ کر غزل اور نظم میں فرق کرنا مشکل لگتا ہے۔کیونکہ حجاب عباسی نے ہر دو صنف کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا ہے۔شاعری کے ساتھ ساتھ ان کو کہانی،افسانہ اور ڈراما لکھنے میں بھی دسترس حاصل ہے۔بحر ہجر سے دو شعر قارئین کے ذوق کی نظر کرتا ہوں۔حجاب عباسی کی شاعری کا اندازا ہو جائے گا۔

میں اکثر سوچتی ہوں زندگی کو کون لکھے گا
نہ میں لکھوں تو پھر اس بے حسی کو کون لکھے گا
بہت مصروف ہیں اہل جہاں ہرزہ سرائی میں
اب آشوب سخن میں بے حسی کون لکھے گا

زہریلے پھول/شاعر: گل زیب عباسی/صفحات: 208/ قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی

پبلشرز: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی

بہاول نگر کے ایک گاؤں ڈونگا بونگا کے رہائشی اُردو، پنجابی کے معروف شاعر جناب گل زیب عباسی کا افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں مارکیٹ میں آیا ہے۔ گل زیب عباسی پورے پاکستان میں کم وبیش 25 جرائد میں اپنی نگارشات سے سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ ان کی پہلی تخلیق ہے۔ کراچی سے مجموعے کا چھپنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کراچی کے ادبی گلستان میں ان کی بھی مہک اور چہک ہے۔ اس مجموعہ میں کل 12 افسانے میں ایک سے ایک منفرد اور جدا ہیں۔ افسانہ نویسی کے تمام پہلوؤں پر مکمل دسترس رکھتے ہوئے افسانوں کا انتخاب اچھا ہے۔ مجھے امید ہے قارئین یقیناً پسند فرمائیں گے۔

ہجرت وہجر/شاعر: سجاد بلوچ/صفحات: 128 / قیمت: 400 روپے/تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی

پبلشرز: سنگ میل پبلی کیشنز 26 شاہراہ قائداعظم روڈ، لوئر مال لاہور

ابھی تک 2013ء میں چھپنے والی اچھی کتابوں میں سے ایک اچھی کتاب جو حال ہی میں چھپ کر دادِ تحسین پا چکی ہے۔ کتاب اور صاحب کتاب سجاد بلوچ کے بارے ملک کے جید ادب نواز اور ادب پرور شخصیات کے تبصرے سجاد بلوچ صاحب کی تعریف میں واقعی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے غزلوں کا انبار ہے جو بہترین ٹائٹل کے ساتھ قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اُمید ہے ہر باذوق فرد کو یقیناً پسند آئے گی۔ ظفر اقبال سجاد بلوچ کے بارے میں لکھتے ہیں'' اکا دکا شعر کے شاعر تو ہمارے ہاں مل جاتے ہیں لیکن چونکا دینے والے اشعار اور وہ بھی اتنی فراوانی کے ساتھ، ایسی مثالیں پوری اردو غزل میں بہت کم ہی دستیاب ہیں۔''

جنت کے پھول
طالب ہاشمی
رسول پاک ﷺ کی مبارک زندگی کے دلچسپ واقعات اور پیاری پیاری نصیحتیں۔ قیمت/120

دینی معلومات
محمد کلیم ارائیں
سکولوں، کالجوں اور دیگر مقابلے کے امتحانوں کے لیے سوالاً جواباً معلوماتی کتاب۔ قیمت/120

شیر شاہ سوری
گوہر ملسیانی
ایک جاگیردار کے گھر میں جنم لینے والا عادل سلطان کی دلچسپ تاریخ قیمت/150 روپے

نامہ ہائے احباب

مکرمی ومحترمی عامر بن علی/حسن عباسی صاحب

سلام مسنون! ماہنامہ ارژنگ کا خوبصورت شمارہ عنایت فرمانے پر مشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔ آمین

آپ کا مجلہ نثر اور نظم کا حسین امتزاج لگا۔ فی زمانہ ادبی رسالہ نکالنا اور اس کا معیار قائم رکھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ امید ہے آپ کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آنے پائے گی اور آپ اپنا سفر پوری دلجمعی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

ابتدا میں نظم اور غزل کے تین مجموعے چھپنے کے باوجود میرا میدان دوہا ہے جس میں گیارہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اپنے چند دوہے آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پورے اُتریں تو ارژنگ کی زینت بنائیے گا۔

احقر

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

***

محترم حسن (اٹک) عباسی صاحب سرتاپا ارژنگ

السلام علیکم۔ آپ کے حسن اور حسن انتخاب سے حرف لے کر ارژنگ صادر ہوا۔ میں اس کے ٹائٹل کے رمزیت اور معنی خیزی میں تادیر ڈوبا رہا۔ رسالہ کیا ہے قدرت کا کرشمہ ہے۔ آپ رسالہ میں پنجاب رنگ سے رنگینیاں بھرتے ہیں۔ میں ہزارہ رنگ کا ڈول ڈالتا ہوں۔ قلم سے کنواں کھودا ہے۔ اس کا پانی میٹھا نہ ہوا نہ سہی پیا تو بہر طور جا سکتا ہے۔ اُمید ہے آپ میری اس جسارت سے ناراض نہ ہوں گے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعتیں دل و جاں سے پڑھیں۔ طرز احساس اور اخلاص مندی نے بہت متاثر کیا۔ پلاک کے زیر اہتمام آپ کی تقریب خوب تھی۔ تصاویر سے آپ کا جلال و جمال اور چمک رہا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ مضامین میں آپ کے خصوص میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ تصویر میں آپ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لگتا ہے باتیں اچھی ہوئی ہوں گی۔ شعری گوشے اسی طرح ہیں، جس طرح ہوتے ہیں (یا جس طرح ہونے ضروری ہیں) ان میں سے ایک یہ شعر دیکھئے:

اس کے لبوں پر میرا نام
آگ لگی ہے پانی میں

اور بھی کئی شعر ہیں جو مثالاً لیے جا سکتے ہیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

***

پیارے عامر بن علی!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' مجھے مل گیا ہے۔ آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے خوبصورت جریدے میں مجھے شامل کیا ہے۔ الگ سے خط لکھ کر تبصرہ بھجواؤں گا۔ ہمیشہ خوش رکھیں۔

جمیل احمد عدیل

***

جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون۔ اُمید ہے آپ بفضل تعالیٰ بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کی طرف سے ارسال کردہ ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کی توجہ اور یاد آوری کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ پرچہ کی تیاری اور ترتیب کے سلسلے میں آپ کی محنت نہایت قابل تعریف ہے۔ دعا ہے کہ رب العزت آپ کو مزید کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین)

سحر صدیقی

اسلام آباد

***

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ارژنگ کے لیے ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ خدا کرے آپ مع اہل خانہ خیریت سے ہوں۔ (آمین)

احقر

نصرت صدیقی

***

ڈیئر حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ جناب علی رضا صاحب کے توسط سے آپ نے مارچ 2013ء کے ارژنگ میں میرا شعری گوشہ صفحہ 49 پر چھاپ کر بڑی مہربانی فرمائی۔ البتہ مجھے جوہر آباد کا مکین لکھنے کی بجائے ساہیوال والوں سے ملا دیا۔ جہاں بڑے بڑے

صاحب علم گزرے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں۔ میں اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب میں آپ کو علی رضا صاحب کی معرفت اپنی تخلیقات بھجوانے کی بجائے آپ کو ہی بھجواؤں گا۔ ورنہ دیر ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو اپنی نظمیں بھجوا رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں گوشے میں جگہ دیں اور علی رضا صاحب سے چند کلمات لکھوا لیں یا خود جو مناسب سمجھیں یا پھر ان کو متفرق شاعری میں جگہ دیں۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔

میرے ایک دوست پروفیسر حمزہ حسیرہ پوسٹ گریجویٹ کالج جوہر آباد نے میری شاعری کے بارے میں ایک تاثر مضمون کی شکل میں مجھے بھجوایا ہے۔ جو میں آپ کو جلد بھجوا رہا ہوں۔ تاکہ ارژنگ کی آمدہ اشاعت میں چھپ سکے۔ انہوں نے میری کتاب کا نام ''غم خانہ دل'' تجویز کیا ہے۔ اگر کسی اور دوست نے یہ نام اپنی کتاب کے لیے پہلے رکھ لیا ہو تو میں اس کو تبدیل کر لوں گا۔

اُمید ہے آپ اور بھائی عامر بن علی خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ارژنگ کے ساتھ اور اپنی زندگی کی دوسری کاوشوں میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ علی رضا صاحب کو میرا سلام۔

ستمبر 2013 کا ارژنگ مل گیا ہے۔ باقاعدگی سے رسالہ بھجوانے کا بہت شکریہ

خیر اندیش
آفتاب راجا

جناب عامر بن علی!

میرے اپنے بھائی حسن عباسی صاحب!

دعائیں، محبتیں! ارژنگ کا تازہ شمارہ مل گیا۔ بہت ممنون ہوں۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی بہت بھرپور اور خوبصورت ہے۔ ڈاکٹر نزہت عباسی کا مضمون ''احمد فراز اور درد آشوب'' کمال کی چیز ہے۔ ویسے تو نزہت عباسی ہمیشہ ہنر سے لکھتی ہیں اور صاحب اسلوب وفکر ادیبہ ہیں۔ مگر یہ مضمون لکھ کر گویا انھوں نے احمد فراز کے قدر دانوں کے دل جیت لیے۔ دوسرا دل کو چھو لینے والا مضمون ''منفرد لہجے کی ممتاز شاعرہ اور کالم نگار ڈاکٹر صغریٰ صدف'' کا تھا۔ پورا مضمون اثر آفرینی سے مزین احساس کو جگا دینے والا تھا۔ شبنم لطیف مبارک باد کی مستحق ہیں۔

محترمہ انیلہ بھلر کا افسانہ ''روگ'' ان کی تحریر کی روایتی آن بان لیے ہوئے ہے۔ سادہ سی کہانی یوں بیان کرتی ہیں کہ پورا معاشرہ اس میں سمٹ آتا ہے۔ بہت سی سچائیوں کو زبان مل جاتی ہے۔ ''نفرت'' (نسیم سکینہ صدف) بے حد اہم موضوع پر انتہائی مہارت سے بنا ہوا افسانہ ہے۔ کہنے کو فسانہ مگر تلخ حقیقت سے بھرا ہوا۔ جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں شاید ہمارے لیے اس وقت اس سے بڑی حقیقت اور کوئی نہیں۔

میرے نبی کا ایک فرمان جس کا مفہوم ہے کہ حیا جس چیز میں ہو اُسے خوبصورت کر دیتی ہے اور جس چیز سے نکل جائے اُسے عیب دار بنا دیتی ہے۔ شاعری میں بہت سے معتبر نام ہیں۔ حصہ غزل حصہ نظم پر بھاری محسوس ہو رہا ہے۔ معین نظامی کی نظم ''آپ ہمارا مسئلہ سمجھیں'' ان کا مخصوص لہجہ اور اسلوب لیے ہوئے ہے۔ پریا تابیتا کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔

وقت کی طرح یہ سانسیں بھی رواں ہیں اب تک
اب بس اشک تھمے اور رُکا کچھ بھی نہیں

ڈاکٹر فوزیہ تبسم، خورشید ربانی، وسیم عباس، ارمان یوسف کی غزلیں پسند آئیں۔ مجموعی طور پر ارژنگ آپ کی محنتوں کا آئینہ دار ہے۔ جیتے رہو۔

آپ کو چاہنے والا فقیر
دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

جناب عامر بن علی اور حسن عباسی جی!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا ہر شمارہ موصول ہوتا ہے۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ مضافات میں لکھنے والوں کو یاد رکھتے ہیں۔ تازہ شمارہ میں گوشہ لگانے پر بے حد مشکور ہوں۔ مسلسل ارژنگ شائع ہونا بھی ادبی جہاد سے کم نہیں۔ ورنہ موجودہ دور میں دو چار شماروں کے بعد سلسلہ اشاعت بند ہو جاتا ہے۔ وجہ شاعروں کی عدم دلچسپی یا افراتفری کے دور میں سلسلہ روزگار ہر آدمی کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بہرحال آپ کا یہ کام بہت بڑا کام ہے جو آپ احسن طریقے سے نبھا رہے ہیں۔ آپ کے تمام سٹاف کو سلام

غزالی/گوجرہ

عامر بن علی صاحب! حسن عباسی صاحب!

بڑی خوشی ہوتی ہے جب ''ارژنگ'' موصول ہوتا ہے۔ ''ارژنگ'' کے آنے کا پورا مہینہ انتظار رہتا ہے۔ اس کو پڑھ کر دل کو تسکین ملتی ہے اور یہ

احساس ہوتا ہے کہ آپ کتنی محنت سے اس کو ترتیب دیتے ہیں۔ آج کے اس افراتفری کے دور میں ادب کی خدمت کرنا بہت بڑا کام ہے اور میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں آپ کی اس کامیابی پر۔

رانا اعجاز احمد

ڈیئر حسن عباسی! سلامت رہو۔

السلام علیکم۔ اُمید ہے تم خیریت سے ہوں گے۔ یہ تمہاری محبت ہے جو تم نے مجھے یاد رکھا اور اپنی خوبصورت شاعری پر مبنی کتابیں مجھے بھیجیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

میں ارژنگ کے لیے کچھ تخلیقات بھیج رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ہمارا یہ قلمی تعاون آئندہ بھی جاری رہے گا۔

جلد ملاقات بھی ہوگی۔ تمہارے سفرنامے کی تقریب کا دعوت نامہ ملا مگر افسوس میں اس وقت لاہور میں نہیں تھا۔ خدا تمہیں اور ترقی دے۔ ہو سکے تو پرچہ بھی بھیج دینا۔

دُعا گو

ڈاکٹر خالد جاوید جان

محترم عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔ ''ارژنگ'' کے لیے ممنون ہوں۔ کچھ ڈاکٹر ظفر کے کاموں اور کچھ اپنے تیسرے شعری مجموعے کی تیاری کے باعث بہت مصروف رہی۔ اب پہلی فرصت میں دو غزلیں بھیج رہی ہوں۔ کوشش کروں گی کہ یہ سلسلہ جاری رکھوں۔ (انشاء اللہ) ارژنگ بہت ہی خوبصورت رسالہ ہے۔ صرف ظاہری طور پر نہیں اپنے مضامین، افسانوں، شاعری اور مختلف ادبی تقاریب کے احوال کے حوالے سے بھی۔ آپ کو اور آپ کے دیگر معاونین کو مبارک باد ایک نظم اور ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ والسلام

حجاب عباسی

محترم جناب عامر بن علی صاحب!

محترم جناب عباسی صاحب!

سلام عرض اے جی۔ تہاڈا رسالہ ارژنگ سوہنا لگیا تے سالانہ خریدار وی ہو گئے آں۔ رب تہانوں ہور ترقیاں دیوے۔ جناب نوں کجھ نظماں گھل رہیا واں اُمید ہے تساں اینہاں نوں چھاپ کے ساڈا مان ودھاؤ گے۔

تہاڈا اکا بھرا

اجمل خیال/ بہاول نگر

حسن عباسی جی

محترم جناب نازو کاڑوی صاحب

مدیر پنجاب رنگ ارژنگ لاہور

السلام علیکم۔ سبھ توں پہلاں تے تہاڈا بوہت بوہت شکریہ کہ تسی سانہوں ایس لائق سمجھیا کے خوبصورت تے بھرویں رسالے ''ارژنگ'' گھلے۔ پرچہ بوہت معیاری اے پڑھ کے خوشی ہوئی دوستاں بیلیاں نے وی بوہت پسند کیتا۔ محترم جناب خاور وحید صاحب نے اپنی کجھ تخلیقات پرچے لئی گھل رہیاں واں۔

رب تہانوں ادب دی خدمت لئی ایسے طرحاں سلامت رکھے۔ آمین

صغیر تبسم

بہاولنگر

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ جناب! سب سے پہلے میری طرف سے آپ کو اور آپ کے تمام اہل خانہ کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے۔ (آمین)

سر! میں اپنی ایک تازہ غزل آپ کی نظر کر رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنے ایک سٹوڈنٹ کی حسب سابق حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ حضور کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

دُعا گو

محمد سرفراز احمد بودلہ/ اوکاڑہ

محترم جناب عامر بن علی!

محترم جناب حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے باقاعدگی سے ''ارژنگ'' بھیجتے ہیں اور میں نیا ارژنگ آنے تک اسے بار بار پڑھتی رہتی ہوں۔ یہ میری تنہائی کا بہترین سہارا ہے۔ اس میں تمام سلسلے بہت ہی اچھے ہیں۔ خاص طور پر شاعری مجھے بہت پسند ہے اور اس میں ہمیشہ اچھے شاعروں کا کلام ہی شامل ہوتا ہے۔ آپ نے گزشتہ دو شماروں میں میری کوئی نظم نہیں لگائی۔ کیا وہ اشاعت کے قابل نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو بتا دیں۔ والسلام

ارسہ مون/ شاہ کوٹ

Funeral of Happiness!

By Koko Di
Islamabad

Your shadow behind the log,
merging in the mist and fog
Fading in the drooping sun,
Leaving all promises undone,
Vanishing in the crimson hue,
Mixing in the frost and dew.
It is an Autumn in the mid of May
And the darkness of the day,
And the rule of loneliness,
And the Funeral of happiness,
And the end of life,
And the finality of strife,
Stress in aimlessly roaming steps,
Soaring high, in the realm of angst
life,
Love fought,
Strives for life and died
In silent sighs,
Uncared words engulfed the night!

....

Isms

by Daya Dissanayake
Sri Lanka

structuralism
modernism
post colonialism
post and post post modernism
isms
and more isms

to hamper
the writer
and tie his hand down

what does it really matter
to the writer
or the reader
should we write
to please
the critics
and the judges of lit awards
or for the lucre
filthy or not

....

Ashok Bhargava

Three Poems - Vancouver Canada. Books Published: (Poetry) Lost In the Morning Calm, Mirror Of Dreams, Half Open Door, A Kernel of Truth, and Skipping Stones. Under Publication: Tomorrow Never Comes and Parallel Lines

....

Terracotta Passion

I live
like a Banyan root
hanging
waiting
to reach the earth
for soil to cling to
for nourishment
for rootedness.

Without you
I am
hovering
waiting for your hands
to hold me
to infuse hope
to energize
to begin life.

With you
I feel alive
I embrace you
like a Banyan root
that has reached the earth
and connected
to the soil.

....

Desire (Trishna)

She
was sad
tear stained face
and silent
why?
Without turning
she lifted her chin up,
and asked
Have you seen an ant
dragging away the wings of a
butterfly?

No, I
answered.
That's good, can you write or
compose?

What I asked.
A poem: a poem enticing a lover to
make love
Why?
I inquired.

I will shred it into million pieces
and burn it
She said.

Then without uttering a word
she got up and left
leaving behind silence.

....

Don't Be Tired

look between the sights
hear between the words
feel between the heart
Smell between the minds
taste between the moments
there you will find
the magic
miracles and more.

Not in jungles
but in cities,
Not the animals
but the humans.
They hunt not daily
But once in years,
And not like robbers or thieves
But
Like nobles,
With the consent of their prey.

A spear of false promises,
A knife of sweet words,
A rope of chanting slogans,
And eye-blinding dust
All they keep to hunt the prey,

And the one whose ARMS work the best
And lead him to success
Eats his prey for years.

The losing hunters
With anger & despair,
Rebuke the successful one
And wish for his death
To accelerate their turn
To eat the same.

....

The Dame

Pashto Poem

by Ajmal Khattak

Translated by Arbab Daud

The sun was rising with its mighty grace
As she left her house with a bright face
She was like sun's bright rays in the clear skies
Despite shining brilliance her modesty won the race

With smiling face she looked around and hushed
While having eye contact with me, she blushed
By God! The virgins of haven will envy this beauty
With shyness even beautiful roses will be flushed

In a shawl, the youth of a heavenly virgin, was draped
Like a cherished dream, in holy scents was she wrapped
While going she was swinging like fresh tree branch
Like a drunk who enjoys being handicapped

The echoes of her anklet, overshadowed her bird-like walking
With her small step, she made melodious drumbeats look like barking
Even her heartbeat held its breath to her splendor
She stopped and looked at me as she noticed me stalking

She changed her style and her walking became swift
She will turn her head back but moved ahead with her drift
Her disturbance shows her uncontrolled heartbeats
For her lover, she was obviously taking a nice gift

The bouquet in her hand is surely for her lover
Her thief-like looks still make my mind hover
The fairy seemed undetermined as she wandered vagrant
She changed track and to necropolis just turned over
She stood for while, then dropped and shattered
The beautiful rose and the bouquet went all scattered
Over a grayish grave lied our beautiful dame
To whom the treasures of this world even never mattered

Jasmines and Tulips were are all lying down in dust
Her hair dispelled over everything, with a thrust
She seemed to have a craving for the fresh grave
Embracing disaster for a life without lust

I thought she will utter profanities and loudly cry
By imagining her words, my mouth went dry
She was lining the flowers on the grave
And with a deep voice, gave her words a try

Oh Martyr! Your death is your sister's pride
Your bullet ridden body is what this grave hide
Oh God! Bring a spring so that his blood can turn into flowers
So that shawls of sisters make red flags to turn the tide

....

Poetry of the month

Our Editor Choice

WHAT IS WRONG WITH THE WORLD?

By Shahroze Suzuki
Bahria University Karachi

What is wrong with the world?
The world that we see today...
What is wrong with the world?
"Everything" is the answer everyone says

What is wrong with the world?
Where our most common visitor is death
What is wrong with the world?
Where babies in their infancytake their final breath

What is wrong with the world?
Where killing is just another day's work...
What is wrong with the world?
When taking another's life won't result in tears - but a smirk

What is wrong with the world?
Where food is more scarce than gold
What is wrong with the world?
"Oh that's how it is"- is every time what we are told

What is wrong with the world?
Where a saint is a sinner - and God declared an illusion
What is wrong with the world?
Where innocents are subjects of horror and persecution
What is wrong with the world?
I'll tell you what - though you may disagree...
What is wrong with the world?
We're free men dammit, yet were waiting to be set free

What is wrong with the world?
Is that we sit and waste away in wait....
What is wrong with the world?
Is that we look the other way - have we accepted our fate?

What is wrong with world?
.....one answer after all the fuss
What is wrong with the world?
sigh...................it's us!

The Last promise

by Shama Bukhari
Karachi

That freezing, silent December night
Those homeless winds and their plight
Even my shadow was not in sight -

Time stopped, stars wept all through that night
Moon travelled a distant land without moonlight
Sky hugged sobbing darkness with mournful recite
Clouds wandered with tearless eyes and no sight -
The room was calm as century quite
The post light stood as a weeping candle light
Flowers summoned grief to rule that site -
Weeping willow assigned me sorrow though her right -

My father lay all pale and white
Gripping my hand with meager might
His legendary strength nowhere to fight
Looking onto my face in gloomy twilight -

And He wiped my tears that stony night
Whispered, though it is hard to write
He uttered ' I love you ' and you get it write
You will not weep, promise me tonight -

And he left me to live and fight -
My orphaned tears and
PROMISE of that night
(a promise was made in painful silence on 12 th Dec)

The Huntsmen

By
Atif Hanif Saqi

Here are some hunters
Hunting since ages,

Vinda

Tissue Papers

پاکستان میں پہلی بار

ٹشو پیپر کی مکمل رینج کے ساتھ

Bebifit Diaper 贝爱多

نہ لیک نہ ریشز کا ڈر

بےبی خوش تو ماں بھی خوش

3Ply, 2Ply اور 4Ply ٹشو پیپرز

متعارف کروانے والی واحد کمپنی

Ali Traders
Authorised Dealer in Pakistan

www.vindapakistan.com
info@vindapakistan.com

042-37246101
0345-4680665, 0333-4302200

A.T
ALFA ACCESSORIES

موبائل فون اسسریز میں اعلیٰ نام

- چارجر
- ہینڈ فری
- پاؤچ
- سکرین پروٹیکٹر
- اور تمام انٹرنل پارٹس
- بیٹری
- کیسنگ

Business centerFirst Floor Hall Road Lahore

www.atalfa.net
042-37210216

معروف شاعر، کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کی نئی کتاب

''آج کا جاپان''

طباعت کے آخری مراحل میں ہے۔

اوساکا یونیورسٹی میں شعبہء اردو کے سربراہ پروفیسر سویامانے

''آج کا جاپان'' کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ!

جاپانی ٹی وی پروگراموں میں سے ایسے پروگرام بہت مقبول ہیں جن میں غیر ملکی لوگ بلائے جاتے ہیں اور وہ لوگ جاپان اور جاپانی لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات بتاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر جاپانی لوگ کبھی خوش ہوجاتے ہیں یا کبھی افسردہ ہوجاتے ہیں۔ دوسروں کی رائے پر جاپانی لوگ اتنا کیوں گھبراتے ہیں؟

اس کی کئی وجوہات ہوں گی اور ان میں سے ایک یہ کہا جاتا ہے کہ جاپان کئی جزائر پر مشتمل ملک ہے اور کسی دوسرے ملک کے ساتھ اس کی زمینی سرحد نہیں ملتی۔ پھر قومی اعتبار سے ایک جیسے لوگ رہتے ہیں، لوگوں کی شکل بھی ایک جیسی ہے اور شاید ہماری اس شکل کی خصوصیت اردو کے محبوب کی جیسی ہوتی ہے کہ یہاں جاپان میں ان نیم باز آنکھوں والے ہی رہتے ہیں۔

ایک جیسے لوگوں کی سرزمین ہونے کی وجہ سے جاپانی لوگ باہر کے لوگوں کی رائے سننا بہت پسند کرتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ایسے واقعات ہوتے ہیں جب کوئی غیر ملکی جاپانی معاشرے کی اجنبیت پر بیان کریں تو اسے اپنی منفرد خصوصیت سمجھ کر خوش ہوجاتے ہیں کہ ہم جاپانی ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ کسی چیز کی شناخت دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی سے زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ کسی شخص یا کسی معاشرے کے بارے میں جاننا چاہیں گے تو دوسرے لوگ ہی اچھی طرح بتا سکیں گے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں اور کیا کیا نہیں ہیں۔

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ''آج کا جاپان'' ایک تجربہ نامہ ہے۔ مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔ اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف عامر بن علی صاحب زیادہ وقت جاپان کے ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جہاں ٹوکیو، اوساکا کی طرح غیر ملکی لوگ زیادہ نہیں رہتے اور سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ ایسے شہر میں رہنے سے جاپان کے روایتی معاشرے کو دیکھنے کا موقع بھی یقیناً انہیں ملا ہوگا۔

طرح طرح کی باتیں عامر صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے آئے ہیں اور اب ''آج کا جاپان'' کتابی شکل میں آئی ہے۔

مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوجائیں گے۔ اور پڑھنے کے بعد آپ کو جاپانی معاشرے کا اندازہ تو ضرور ہوگا۔ لیکن سب سے مزے کی بات تو یہ ہوگی کہ آپ کے سامنے پاکستان اور پاکستانی کا تصور پہلے سے زیادہ نمایاں نظر آئے گا۔

پروفیسر سویامانے

صدر شعبہ اردو اوساکا یونیورسٹی

اوساکا، جاپان

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔
nastalique786@gmail.com
03004489310 - 04237351963

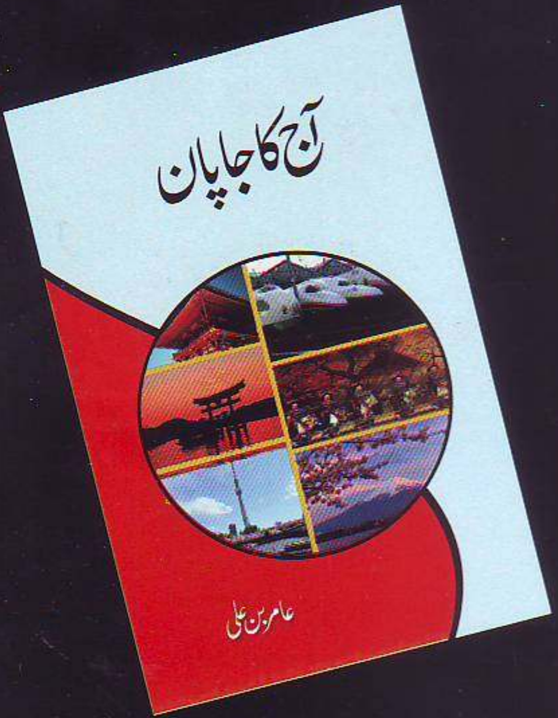

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com